جون ۹۳

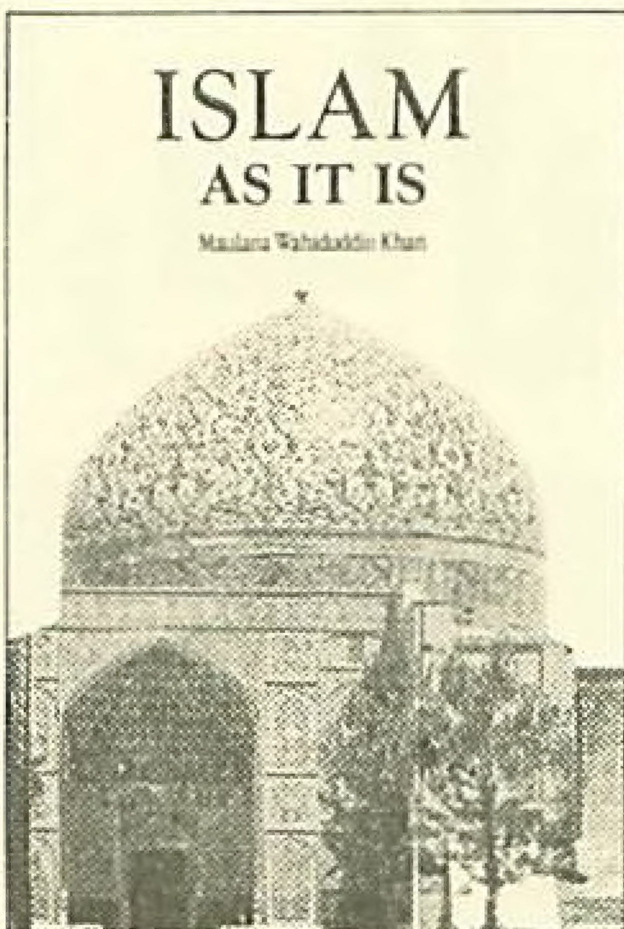
MAKTABA AL-RISALA
1439 OCEAN AVE. # 4C
BROOKLYN, N. Y. 11230
TEL.: (718) 258-3435

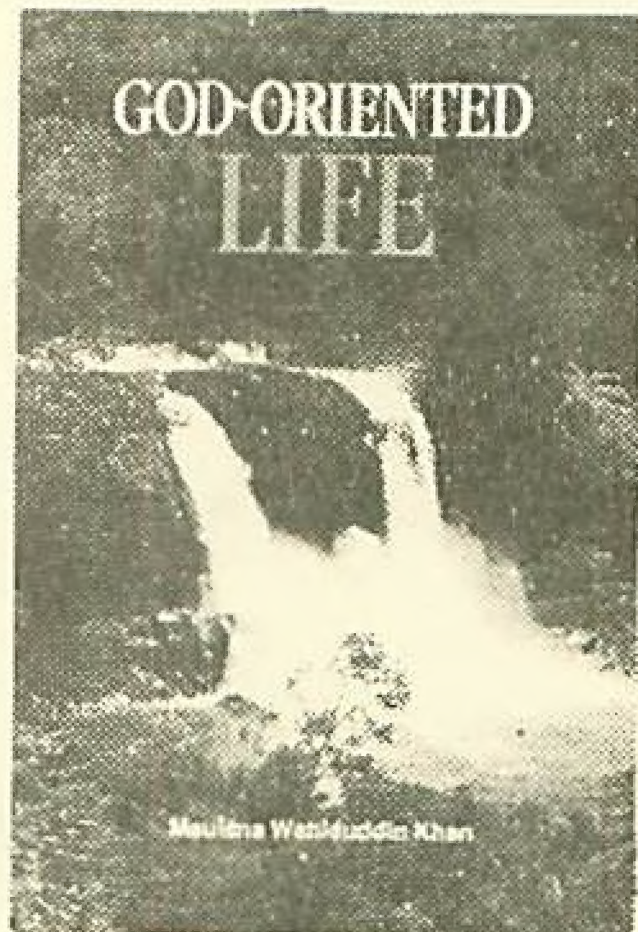
الرسالہ
Al-Risala

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز



اخلاق کے ذریعہ دل کو جیتا جا سکتا ہے
اور دل کو جیتنے کے بعد کوئی اور چیز باقی نہیں رہتی
جس کو جیتنے کی ضرورت ہو





ISLAM AS IT IS

By Maulana Wahiduddin Khan

Pages 114 Rs. 40

In *Islam As It Is,* Maulana Wahiduddin Khan presents the fundamental teachings of Islam in a manner which will appeal directly to both general readers and students of Islam.

Simple and straightforward in style, *Islam As It Is* gives the reader an accurate and comprehensive picture of Islam — the true religion of submission to God.

GOD-ORIENTED LIFE

By Maulana Wahiduddin Khan

Pages 186 Rs. 60

The traditions – Sunnah – of the Prophet Muhammad, upon whom be peace, and the lives of his companions and those closely associated with them, serve as a major source of religious enlightenment in theory and in practice. This book endeavours to present these ideas in the simplest and most direct way. In that it culls from authentic sources the sayings and deeds of the Prophet and those inspired by him, it brings to us a complete and, above all, human picture of true Islamic behaviour.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

MAKTABA AL-RISALA
1439 OCEAN AVE. # 4C
BROOKLYN, N. Y. 11230
TEL.: (718) 258-3435

الرسالہ

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

جون ۱۹۹۳، شمارہ ۱۹۹

نماز ذریعہ علاج	۴	امن کمیٹی	۱۲
کلمۂ حکمت	۵	فرق کو جانئے	۱۳
قرآن میں تفکر	۶	ہندو مسلم ڈائیلاگ	۱۴
شکر خداوندی	۷	نئے عہد کے دروازہ پر	۱۸
روح دین	۸	حج اسپرٹ	۲۶
زمانہ کا فرق	۹	غلطی کی تصحیح	۲۸
انسان کی تبدیلی	۱۰	ایک سفر	۲۹
سب سے بڑی ناقدری	۱۱	خبرنامہ اسلامی مرکز ۸۹	۴۷

AL-RISALA (Urdu) Monthly
1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110013, Tel 4697333, 611128
Fax 91-11-4631891 (Attn : Al-Risala)
Single Copy Rs 6: Annual Subscription Rs 70/$25 (Air-mail)

نماز ذریعۂ علاج

كانَ فتىً من الانصار يصلي مع النبي صلى الله عليه وسلم ولا يدع شيئا من الفواحش والسرقة الا ركبه. فذكر للنبي صلى الله عليه وسلم فقال : ان الصلاة ستنهاه۔ فلم يلبث أن تاب وصلحت حاله۔ فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم : الم اقل لكم

(الجامع لاحکام القرآن ۱۳/۴۸- ۳۴۷)

انصار کا ایک نوجوان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھتا تھا۔ مگر اسی کے ساتھ وہ فواحش اور سرقہ کا بھی ارتکاب کرتا تھا۔ اس کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا گیا۔ آپ نے فرمایا کہ نماز عنقریب اس کو ان چیزوں سے روک دے گی۔ آخر کار اس نے توبہ کرلی اور اس کا حال درست ہو گیا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا۔

نماز اگر واقعی شعور کے ساتھ پڑھی جائے تو وہ آدمی کے اندر حساسیت کو جگانے کا ذریعہ بنتی ہے۔ جب آدمی کے اندر دینی حساسیت جاگ اٹھتی ہے تو اس کے بعد وہ اپنے آپ اصلاح کے راستہ کو اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے بعد نماز اس کے لیے صرف ایک روایتی عمل نہیں رہتی، بلکہ وہ اس کے اوپر نگراں بن جاتی ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے : ان الصلاة تنهىٰ عن الفحشاء والمنكر (نماز آدمی کو فحش اور بری باتوں سے روکتی ہے)

مذکورہ نوجوان پہلے بے شعوری کی نماز پڑھتا تھا۔ دھیرے دھیرے اس کا ذہن بدلا۔ وہ چونکہ عربی جانتا تھا، اس لیے قرآن کی قرأت اور نماز کی دوسری دعائیں اور اذکار اس کے ذہن پر اثر ڈالتے رہے۔ مسجد میں اہلِ ایمان سے ملاقات اور گفتگو اس کو نئی سوچ کی طرف بڑھاتی رہی۔ اس طرح کی مختلف چیزیں مسلسل اس کے اوپر اثر انداز ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ بے روح نمازی سے اوپر اٹھ کر وہ سچا نمازی بن گیا۔

ہر شکل کے ساتھ ایک اسپرٹ ہوتی ہے۔ کوئی آدمی اگر شکل کو پوری طرح اختیار کر لے تو اسپرٹ بھی دھیرے دھیرے اس کے اندر پیدا ہو جائے گی۔

کلمۂ حکمت

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں بتاتی ہیں پ کو جب بھی دو صورتوں میں سے ایک صورت کا اختیار کرنا ہوتا تو آپ ہمیشہ آسان صورت نتخاب فرماتے تھے (ماخیّر بین امرین إلا اختار ایسرهما)

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ دانش مند وہ نہیں جو خیر اور شر کے فرق کو جانے۔ دانش مند وہ ہے جو یہ جانے کہ دو شر میں سے کون سا خیر ہے (لیس العاقل الذی یعرف خیر من الشر ولکنہ الذی یعرف خیر الشرین) العبقریات الاسلامیۃ للعقاد، صفحہ ۵۰۵

اسی بات کو امام شافعیؒ نے اس طرح کہا کہ دانش مند وہ نہیں ہے جس کو خیر اور شر کے درمیان ناب کرنا ہو اور وہ ایک چیز کا انتخاب کر لے۔ دانش مند تو وہ ہے جو دو شر کے درمیان جائے اور پھر دونوں میں سے جو آسان ہے اس کا انتخاب کرے (لیس العاقل ذی یقع بین الشر والخیر فیختار۔ إنما العاقل الذی یقع بین الشرین ختار ایسرهما) الامام الشافعی، تالیف عبد الحلیم الجندی، القاہرہ، صفحہ ۴۹

اس معاملہ کو سمجھنے کے لیے ایک مثال لیجئے۔ شہر میں غیر مسلموں کا ایک جلوس نکلتا ہے۔ وہ مسلم لف نعرہ لگاتا ہوا مسلمانوں کے محلہ سے گزرتا ہے جو مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کر دینے والا ہے۔ یہ بظاہر شر کی ایک صورت حال ہے۔ لیکن بار بار کا تجربہ بتاتا ہے کہ مسلمان اگر اس شر کو انے کے لیے اٹھیں تو ایسا نہیں ہوتا کہ جلوس کا خاتمہ ہو جائے۔ اس کے بجائے عملاً جو چیز پیش ن ہے وہ یہ کہ جلوس کا معاملہ بڑھ کر فساد کا معاملہ بن جاتا ہے۔

گویا اس مسئلہ میں مسلمانوں کے لیے واقعی انتخاب جلوس اور بے جلوس میں نہیں ہے۔ جلوس اور فساد میں ہے۔ اب مذکورہ اسلامی اصول کے مطابق، عقل مند وہ ہے جو جلوس کو ارہ کر لے تاکہ وہ ہلاکت خیز فساد سے بچ جائے۔

موجودہ دنیا میں تمام معاملات کا حال یہی ہے۔ یہاں اکثر اوقات کم شر اور زیادہ شر کے میان انتخاب کا مسئلہ رہتا ہے نہ کہ خالص شر اور خالص خیر کے درمیان۔

قرآن میں تفکر

قرآن میں کہا گیا ہے کہ ـــــ بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات ا
دن کے باری باری آنے میں عقل والوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں، جو کھڑے اور بیٹھے اور ا
کروٹوں پر اللہ کو یاد کرتے ہیں، اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے ہیں۔ وا
اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے رب، تو نے یہ سب بے مقصد نہیں بنایا۔ تو پاک ہے، پس ہم کو آگ
کے عذاب سے بچا (آل عمران ۹۱ - ۱۹۰)

تمام بہترین باتیں آدمی کو غور وفکر کے ذریعہ حاصل ہوتی ہیں۔ ایک عرب شاعر نے نہایت
صحیح کہا کہ جب آدمی کے اندر فکر اور سوچ کی کیفیت ہوتی ہے تو ہر چیز سے اس کو نصیحت حا
ہوتی ہے :

اذا المرء کانت لہ فکرۃ ففی کل شیء لہ عبرۃ

اس آیت کے سلسلہ میں مختلف حدیثیں منقول ہوئی ہیں۔ مثلاً ایک روایت ـ
مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو لوگ ان آیتوں کو پڑھیں ان کو چاہیے کہ وہ ا
پر غور کریں (فلیتفکروا فیہا) آپ نے فرمایا کہ اس شخص کی خرابی ہے جس نے ان آیتو
کو پڑھا مگر اس پر غور نہیں کیا (ویل لمن قرأ ھٰذہ الآیات ثم لم یتفکر فیھا) ۴۴۱

امام الاوزاعی سے پوچھا گیا کہ ان آیات میں تفکر سے کیا مراد ہے۔ انھوں نے جواب
کہ آدمی ان کو پڑھے اور وہ ان کو سمجھے (قیل للاوزاعی ما غایۃ التفکر فیھ
قال : یقرؤھن وھو یعقلھن) ۱/۴۴۱

عامر بن عبد قیس کہتے ہیں کہ میں نے ایک سے زیادہ اصحاب رسول کو یہ کہتے ہوئے
کہ ایمان کی روشنی غور وفکر ہے (ان ضیاء الایمان التفکر) حضرت عمر بن عبد ال
نے کہا کہ اللہ کی نعمتوں پر غور کرنا سب سے اعلیٰ عبادت ہے (الفکرۃ فی نعم اللہ
افضل العبادۃ) بشر بن الحارث الحافی نے کہا کہ اگر لوگ اللہ کی عظمت میں غور کریں تو وہ
گناہ نہ کریں (لو تفکر الناس فی عظمۃ اللہ تعالی لما عصوہ)

شکر خداوندی

انسان کو چاہیے کہ وہ اللہ کا شکر کرنے والا بنے۔ شکر گزاری پورے دین کا خلاصہ ہے۔ ن میں بار بار مختلف انداز میں اس کی تاکید کی گئی ہے۔ حتیٰ کہ شکر کو سب سے بڑی حکمت بتایا ہے۔ ارشاد ہوا ہے کہ ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی کہ اللہ کا شکر کرو۔ اور جو شخص شکر کرے گا ہ اپنے ہی لیے شکر کرے گا اور جو ناشکری کرے گا تو اللہ بے نیاز ہے، خوبیوں والا ہے (لقمان ۱۲)

انسان کے پاس جو کچھ ہے، سب اللہ کا دیا ہوا ہے۔ انسان کا جسم، اس کی ذہنی صلاحیتیں، رگی کے تمام مواقع، ہر قسم کے وسائل و ذرائع سے بھری ہوئی دنیا، شمسی نظام اور ساری کائنات، ن ذرہ سے لے کر ستاروں تک تمام چیزیں خدا کا عطیہ ہیں۔

ان بے شمار اعلیٰ چیزوں کو دیکھ کر ایک طرف اللہ کی عظمت کا احساس ابھرتا ہے۔ دوسری ف انسان کے سینہ میں یہ سیلاب امنڈ پڑتا ہے کہ اللہ کا یہ کتنا بڑا احسان ہے کہ اس نے مجھ کو ہر ورت اور ہر راحت کی چیز انتہائی وافر مقدار میں فراہم کر دی، جب کہ میں ان میں سے کسی چیز کو ا پیدا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ یہ احساسات آدمی کے اندرونی وجود میں طوفان بن کر نڈتے ہیں اور پھر اعتراف کے کلمات کی صورت میں اس کی زبان سے بے تابانہ نکل پڑتے ں، اسی کا نام شکر ہے۔

اس سلسلہ میں ایک حدیث نہایت سبق آموز ہے۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت م احمد اور امام الترمذی نے نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شخص انسانوں کا شکر نہ کرے وہ اللہ کا شکر بھی نہیں کرے گا (من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ علامت کیا ہے جو یہ بتاتی ہے کہ آدمی کے اندر شکر خداوندی کیفیت موجود ہے یا نہیں۔ وہ علامت شکر انسانی ہے۔ اگر لوگوں کے اندر انسانوں کا شکر کرنے زاج پایا جائے تو سمجھنا چاہیے کہ ان کے اندر اللہ کا شکر ادا کرنے کی صفت بھی موجود ہے۔ اور یہ دکھائی دے کہ لوگ انسانی احسان کا شکر ادا کرنے کی صفت سے خالی ہو گئے ہیں تو سمجھ لینا چاہیے ہ خداوندی احسان کا شکر ادا کرنے کی صفت سے بھی خالی ہیں۔

روح دین

ایک سفر کے دوران مجھے ایک ایسے ملک میں جانا پڑا جہاں پہلے بادشاہی نظام تھا۔ ا
بادشاہ کا خاتمہ ہو گیا۔ اب وہاں صدر راج قائم ہے۔ قدیم شاہی محل کی تمام شان و شوکت
ہے۔ البتہ اب اس کو شاہی محل کے بجائے صدارتی محل کہا جاتا ہے۔

میں اور کانفرنس کے دوسرے شرکا صدر مملکت سے ملاقات کے لیے صدارتی محا
لے جائے گئے۔ ہم لوگ جب اس پُر ہیبت عمارت میں داخل ہوئے تو میں نے دیکھا کہ ہرا
کا انداز اچانک بدل گیا ہے۔ لوگوں پر خاموشی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ ان کی رفتار سست
چہرے پر سنجیدگی کے آثار ظاہر ہو گئے۔ محل کی ہر چیز کو وہ پُر رعب نظروں سے دیکھنے لگے۔

اس منظر کو دیکھ کر میں نے سوچا کہ یہ دنیا جس میں ہم رہتے ہیں، وہ بھی خدا کا ایک عظ
محل ہے۔ اس میں ہر طرف خدا کی عظمت و قدرت کے جلوے نمایاں ہیں۔ اس خدائی محل کے
چلتے ہوئے مزید اضافہ کے ساتھ آدمی پر وہ کیفیت طاری ہونا چاہیے جو کسی شاہی محل کے ا
چلتے ہوئے اس کے اندر طاری ہوتی ہے۔

مگر جب میں دنیا کے راستوں میں لوگوں کو چلتے ہوئے دیکھتا ہوں تو یہ محسوس کر
میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ یہاں لوگ اس طرح چل رہے ہیں گویا کہ انھیں
عظیم حقیقت کی کوئی خبر ہی نہیں۔ لوگوں کے چہروں پر خشوع جھلکتا ہوا نظر نہیں آتا جو از رو
واقعہ ان کے چہروں پر جھلکنا چاہیے۔

لوگوں کے چہروں پر مجھے احتیاط کے بجائے غفلت نظر آتی ہے۔ ان کی چال تواضع ـ
بجائے سرکشی کی چال معلوم ہوتی ہے۔ ان کے انداز پر ذمہ داری کے بجائے بے حسی کا غلبہ دکھ
دیتا ہے۔ خدا کی دنیا میں چلتے ہوئے لوگ اتنا سنجیدہ بھی نظر نہیں آتے جتنا کوئی شخص ک
ایوان صدارت یا کسی قصر شاہی میں چلتے ہوئے نظر آتا ہے۔

جن لوگوں کا حال یہ ہو کہ انسانی محل میں چلتے ہوئے ان پر ہیبت طاری ہو مگر خدائی مح
میں چلتے ہوئے ان پر ہیبت طاری نہ ہو وہ خدا کی رحمت سے آج ہی دور ہو گئے۔

زمانہ کا فرق

چمگادڑ کی عادت ہے کہ وہ عام چڑیوں کی طرح نہیں بیٹھتا۔ بلکہ بیٹھنے والی جگہ کو پیروں سے پکڑ کر لٹک جاتا ہے۔ چمگادڑ کی یہ عادت قدیم زمانہ میں اس کے لیے کوئی خطرہ نہیں تھی۔ وہ شاخ یا اس قسم کی دوسری چیزوں پر لٹکتا اور پھر جب چاہتا اڑ جاتا۔

مگر اب بجلی کے زمانہ میں چمگادڑ کی یہ عادت اس کے لیے موت کا سبب بن گئی ہے۔ عام چڑیاں اب بھی بجلی کے تار پر بیٹھتی ہیں اور اڑ جاتی ہیں۔ مگر چمگادڑ بجلی کے تار پر آتا ہے تو وہ اس کے لیے موت کا پیغام ثابت ہوتا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ بجلی کا صرف ایک تار چھونا خطرناک نہیں ہے۔ خطرناک یہ ہے کہ اس کے دونوں تاروں کو بیک وقت چھوا جائے۔ عام چڑیاں صرف ایک تار پر بیٹھتی ہیں۔ ان کا تعلق دوسرے تار سے ہونے نہیں پاتا اس لیے وہ محفوظ رہتی ہیں۔ اس کے برعکس چمگادڑ اپنی عادت کی وجہ سے تار کو پکڑ کر لٹکتا ہے۔ قدرتی طور پر اس کا جسم دوسرے تار کو بھی چھونے لگتا ہے۔ اس کی وجہ سے شارٹ سرکٹنگ ہوتی ہے اور وہ مر جاتا ہے۔

چمگادڑ کے لیے یہ عذر ہے کہ اُس کو زمانہ کے اِس "فرق" کا پتہ نہیں۔ مگر عجیب بات ہے کہ یہی غلطی اکثر وہ انسان کرتا ہے جس کو اس کے پیدا کرنے والے نے عقل اور شعور دیا ہے۔ وہ زمانہ کے فرق کو جاننے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کے باوجود وہ اس طرح عمل کرتا ہے جیسے وہ چمگادڑ ہے نہ کہ عقل و ہوش والا انسان۔

موجودہ زمانہ میں جو فرق پیدا ہوئے ہیں، ان میں سے ایک فرق یہ ہے کہ آج کا زمانہ کسی انسان کو اظہار رائے کی مکمل آزادی دیتا ہے۔ مگر تشدد کو وہ مکمل طور پر جرم قرار دیتا ہے۔ ماضی میں یہ فرق اتنی واضح صورت میں موجود نہ تھا۔ اب جو لوگ اس فرق کو سمجھیں وہ امن کے دائرہ میں رہ کر اپنا کام کریں گے، وہ تشدد کے دائرہ میں داخل نہ ہوں گے اور اس طرح کامیاب رہیں گے۔ اس کے برعکس جو لوگ اپنے ماضی کے ذہن کی بنا پر اس فرق کو نہ سمجھیں وہ اپنی جدوجہد میں اس کو ملحوظ نہ رکھیں گے۔ وہ امن کے دائرہ سے گزر کر تشدد کے دائرہ میں داخل ہو جائیں گے، اور نتیجۃً ناکامی سے دوچار ہوں گے۔

انسان کی تبدیلی

دنیا کے وہ تمام لوگ جن کی طرف بڑی بڑی فتوحات کو منسوب کیا جاتا ہے ، ان کی فتوحات صرف سیاسی فتوحات ہیں۔ انھوں نے حکومتوں کو بدلا، مگر وہ انسان کو بدلنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ تاریخ کی تمام کامیاب مثالیں تبدیلیٔ حکومت کی مثالیں ہیں نہ کہ تبدیلیٔ انسان کی مثالیں۔ ہندستان میں بظاہر ایک "مہاتما" کے ذریعہ نظام کی تبدیلی عمل میں آئی۔ مگر ہندستان کی مثال بھی اس معاملہ میں کچھ مختلف نہیں۔ یہاں ۱۹۴۷ میں حکومت بدلی۔ بدیسی حکمرانوں کے بجائے دیسی حکمراں اقتدار پر قابض ہو گئے۔ مگر جہاں تک انسان کا تعلق ہے۔ اس میں کوئی حقیقی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔

یہی خاص وجہ ہے جس کی بنا پر حکومتوں کی تبدیلی حالات کی تبدیلی کے ہم معنی نہیں بنتی۔ بلکہ اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ حکومت کی تبدیلی کے بعد جو نیا نظام بنتا ہے وہ پہلے سے بھی زیادہ برا ہوتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ ——— انقلاب اس کامیاب کوشش کا نام ہے جس کے ذریعہ ایک خراب حکومت سے نجات پاکر ایک خراب تر حکومت اپنے اوپر مسلط کر لی جائے :

A revolution is a successful effort to get rid of a bad government and set up a worse.

پوری تاریخ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال واحد مثال ہے جب کہ صرف حکومت نہیں بدلی، بلکہ اسی کے ساتھ انسان بھی مکمل طور پر تبدیل ہو گئے۔

اس کا بنیادی سبب پیغمبر اور سیاسی لیڈر کے طریق کار کا فرق ہے۔ لیڈر ہمیشہ سیاسی اور معاشی مسائل کو لے کر اٹھتا ہے۔ وہ عوام کو وقت کے حکمراں کے خلاف بھڑکا کر اپنا مقصد حاصل کرتا ہے۔ اس کے برعکس پیغمبر آخرت کے مسائل کو لے کر اٹھتا ہے۔ وہ انسان کو خود اپنی ذات کے خلاف سوچنے کا پیغام دیتا ہے۔ لیڈر احتساب غیر کی بنیاد پر تحریک چلاتا ہے اور پیغمبر احتساب خویش کی بنیاد پر۔ انھیں دونوں لفظوں میں دونوں کے انجام کا فرق چھپا ہوا ہے۔

پیغمبر کا اسوہ اور تاریخ کا تجربہ بتاتا ہے کہ حکومتوں کو توڑنا کوئی کام نہیں۔ انسان کو بدلو، اس کے بعد حکومت کا نظام اپنے آپ بدل جائے گا۔

سب سے بڑی ناقدری

آدمی کے اندر ایک سوئی کے زخم کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں، اس کے باوجود آدمی اتنے بڑے بڑے جرم کرتا ہے کہ اگر اس کو بلڈوزر کے نیچے ڈال کر پیس دیا جائے اور ہزار سال تک پیسا جاتا رہے۔ تب بھی وہ اس کی سزا کے لیے کافی نہ ہو ۔۔۔۔ ایک آہ کے ساتھ یہ الفاظ میری زبان سے نکلے۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے آزادی دی، اور اسی کے ساتھ اس کو اچھے اور برے کی تمیز عطا فرمائی۔ انسان کو اس طرح اس لیے پیدا کیا گیا تاکہ وہ خود اپنے ارادہ سے برائی کو چھوڑ دے اور اچھائی کو پکڑ لے۔ وہ اپنے ذاتی فیصلہ کے تحت سرکشی سے بچے اور فرماں برداری کے طریقہ کو اپنا طریقہ بنائے۔

یہ گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کے لیے ترقی اور کامیابی کا عظیم الشان موقع کھولنا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اس کو وہ سب سے بڑا انعام دیا جائے جو وسیع کائنات میں کسی بھی دوسری مخلوق کو نہیں دیا گیا۔ یعنی سرکشی کا امکان ہوتے ہوئے خود اپنے ارادہ سے اپنے آپ کو اللہ کی ماتحتی میں دیدینا۔ یہ اللہ کے نزدیک انتہائی پسندیدہ عمل تھا۔ چنانچہ اللہ نے اس کے بدلہ میں انسان کے لیے ایسی ابدی جنتیں مقدر کیں جن سے زیادہ نفیس اور پرراحت چیز تصور کے درجہ میں بھی کسی کے لیے ممکن نہیں۔

مگر انسان کو دیکھئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی کو اس واقعہ کی خبر ہی نہیں، جیسے کسی کو اس ربانی منصوبہ سے کوئی دلچسپی ہی نہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی کو فرصت ہی نہیں کہ وہ اس امکان کو جانے اور اس قیمتی موقع کو اپنے حق میں استعمال کرنے کی کوشش کرے۔ تمام لوگ آنکھیں بند کرکے جہنم کی طرف بھاگے جارہے ہیں، کسی کو جنت کے دروازے کی طرف دیکھنے کی جیسے فرصت ہی نہیں۔

یہ گویا خدا کی پکار کو نظر انداز کرنا ہے۔ یہ خدا کی میزبانی کو قبول نہ کرنے کے ہم معنی ہے۔ یہ بلاشبہ سب سے بڑی ناقدری ہے جو کوئی انسان کر سکتا ہے۔ اور سب سے بڑی ناقدری کا انجام سب سے بڑی سزا کے سوا اور کچھ نہیں۔

آہ وہ دنیا جہاں لوگ جہنم کا لفظ بولیں مگر کوئی جہنم سے ڈرنے والا نہ ہو۔ جہاں لوگ جنت کا نام لیں مگر کوئی نہ ہو جو جنت کی سچی طلب سے اپنے سینہ کو آباد کیے ہوئے ہو۔ کیسی عجیب ہے یہ دنیا اور کیسی عجیب ہوگی اس دنیا کے بعد آنے والی آخرت۔

امن کمیٹی

دہلی کے اردو روزنامہ قومی آواز (۱۹ جنوری ۱۹۹۲) میں ایک خبر شائع ہوئی ہے۔ اس کا عنوان ہے : مسجد، مندر سے لاؤڈ اسپیکر ہٹا لینے کا کولھاپور میں متفقہ فیصلہ۔ پوری خبر اس طرح ہے :

"مسلم مذہبی رہنماؤں اور بھارتیہ لوک آندولن کے رہنماؤں نے مسجدوں سے لاؤڈ اسپیکر ہٹانے کا اور مہا آرتی فوراً ختم کر دینے کا متفقہ فیصلہ کر لیا ہے۔

ضلع مجسٹریٹ کے ترجمان نے بتایا کہ ۱۶ جنوری کو ضلع کلکٹر اجیت کمار جین کی جانب سے امن کی اپیل کے جواب میں گزشتہ رات یہاں مسلم مذہبی رہنماؤں اور آمھی بھارتیہ لوک آندولن کے رہنماؤں کی ایک میٹنگ میں یہ فیصلہ کیا گیا۔ ترجمان نے کہا کہ لاؤڈ اسپیکروں کے ذریعہ نماز اور مہا آرتی کی وجہ سے پچھلے ایک ہفتہ سے شہر میں کشیدگی پیدا ہو رہی تھی۔ اس کے نتیجہ میں شہر میں آتش زنی اور پتھراؤ کی وارداتوں کی اطلاعات مل رہی تھیں۔

ضلع کی تمام سیاسی جماعتوں نے اس فیصلہ کو سراہتے ہوئے کہا ہے کہ اس سے شہر میں امن اور بھائی چارہ برقرار رکھنے میں مدد ملے گی۔ (صفحہ ۱)

یہ ایک خوش کن چیز ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں نے اب یہ فیصلہ کیا ہے کہ باہمی اختلاف پیش آنے کی صورت میں وہ ایک دوسرے کے خلاف صف آرائی نہیں کریں گے۔ بلکہ وہ اپنے اختلافات کو بھائی چارہ کے اصول پر حل کریں گے۔

ضرورت ہے کہ ہر شہر اور ہر بستی میں امن کمیٹی بنائی جائے۔ اس میں ہندو اور مسلمان دونوں طرف کے بزرگ لوگ شامل ہوں۔ جب بھی دونوں فرقوں میں کوئی اختلافی بات پیش آئے یا کسی بات پر تناؤ کی فضا ہو تو فوراً امن کمیٹی کے لوگ بیٹھ کر مشورہ کریں۔ اور باہمی مشورہ سے معاملہ کو ختم کرنے کی کوشش کریں۔

امن کمیٹی اس قسم کے مسائل کو حل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ یہ تجربہ ہے کہ جہاں کہیں بھی امن کمیٹی بنائی گئی وہاں وہ فساد کے خلاف ایک طاقتور چیک بن گئی۔ اسی کامیاب تجربہ کو ہر جگہ دہرانے کی ضرورت ہے، خواہ وہ چھوٹی جگہ ہو یا کوئی بڑی جگہ۔

فرق کو جانئے

رشید احمد صدیقی (۱۹۷۷-۱۸۹۲) اردو کے مشہور ادیب تھے۔ وہ مسلم یونی ورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر رہے۔ آل احمد سرور نے ان کا ایک واقعہ اس طرح لکھا ہے :

ڈاکٹر ضیاء الدین نے نظام حیدر آباد کو علی گڑھ بلایا۔ ایڈریس لکھنے کی خدمت رشید صاحب کے سپرد ہوئی۔ رشید صاحب نے بڑے چاؤ سے ایڈریس لکھا، اور مجھے بھی سنایا۔ میں نے کہا "دیکھ لیجئے گا، پسند نہ آئے گا"۔ بولے "کیوں"۔ میں نے کہا : "اس میں خوشامد کم ہے، ادبی رنگ زیادہ، ڈاکٹر صاحب کی سمجھ میں نہ آئے گا"۔ یہی ہوا۔ ایڈریس سن کر کہنے لگے "کچھ جنچا نہیں، پھر کوشش کیجئے"۔ رشید صاحب نے نظر ثانی کی اور پھر پیش کیا۔ رشید صاحب نے لکھا تھا: "مغلوں کے عہد نے ہندستان کو تین تحفے دیے۔ تاج محل، غالب اور دولت آصفیہ"۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ "نظام حیدر آباد کے سلسلے میں تاج محل کے ذکر کا کیا موقع ہے؟" غرض کئی دفعہ ایڈریس میں کانٹ چھانٹ ہوئی اور ڈاکٹر ضیاء الدین اور ان کے حواریوں کی جبین پر شکن ہی رہی۔ آخر رشید صاحب نے کہا کہ "مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ آپ کسی اور سے لکھوا لیجئے"۔ اس پر ڈاکٹر صاحب بہت چراغ پا ہوئے، اور رشید صاحب کی غیبت میں کہنے لگے کہ "اگر اردو شعبے کے لوگ ایک ایڈریس نہیں لکھ سکتے، تو ایسے شعبے کی ضرورت ہی کیا ہے؟"

(رشید احمد صدیقی، مرتبہ مالک رام، صفحہ ۴۳)

ڈاکٹر ضیاء الدین (سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی) ایک سائنس داں تھے۔ مگر انھوں نے اپنے اس تبصرہ میں ایک غیر سائنسی بات کہی۔ ان کی غلطی یہ تھی کہ انھوں نے ایڈریس اور قصیدہ میں فرق نہیں کیا۔ شعبۂ اردو جس مضمون کو تیار کرنے میں "ناکام" ہوا تھا، وہ مدحیہ قصیدہ تھا نہ کہ فی الواقع ایڈریس۔ اس کا تیار کردہ مضمون پورے معنوں میں ایڈریس تھا، البتہ وہ مدحیہ قصیدہ نہ تھا۔

آدمی کو چاہیے کہ وہ ایک چیز اور دوسری چیز کے درمیان فرق کرے۔ عام طور پر لوگ اس طرح فرق کر کے نہیں سوچ پاتے، اس لیے وہ اکثر رائے قائم کرنے میں غلطی کر جاتے ہیں۔ وہ ایک صورت معاملہ پر دوسری صورتِ معاملہ کو قیاس کر لیتے ہیں۔ حالانکہ دونوں کی نوعیت ایک دوسرے سے جدا ہوتی ہے۔

ہندو مسلم ڈائیلاگ

ڈاکٹر سید عابد حسین (۱۸۹۶ - ۱۹۷۸) نے اپنی کتاب مسلمانان ہند کی تقدیر The Destiny of Indian Muslims میں یہ نشاندہی کی ہے کہ ۱۹۴۷ کے بعد انڈیا میں جو انقلاب آیا ہے اس کے بعد یہاں کے سماجی اور سیاسی حالات میں بنیادی تبدیلی آچکی ہے۔ اب انڈیا میں جمہوریت کا نظام ہے۔ مگر ہندستانی مسلمان ابھی تک قدیم حاکمانہ دور میں سوچ رہے ہیں۔ سوچ کا یہ پچھڑاپن ہی ان کے تمام مسائل کا بنیادی سبب ہے۔

۱۹۴۷ سے پہلے برٹش دور میں ان کا سابقہ ایک ایسی گورنمنٹ سے تھا جو یہاں کے عوام کے سامنے جواب دہ نہیں تھی۔ اس کی حیثیت ایک مختار کل (Supreme Arbiter) کی سی تھی جو عوام کی مرضی کا لحاظ کیے بغیر کارروائی کر سکتی تھی۔ مگر اب انڈیا ایک جمہوریت ہے۔ اب یہاں کے حکمراں کو عوام کی مرضی کے مطابق کام کرنا ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ یہاں کے عوام سے اپنے معاملات طے کریں نہ کہ حکمرانوں سے۔

مگر انڈیا کے مسلمان اب بھی اپنے معاملات میں حکومت کی طرف دیکھتے ہیں۔ وہ آج بھی اپنے مسائل کو گورنمنٹ کے پاس لے جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ ان کے مسائل کو حل کر دے گی:

But Muslims still labour under the impression that solution of their problems is in the hands of the Government. To the Government alone they take their troubles and from it alone they expect a remedy (p.295).

مسلمانان ہند کی جدید تاریخ کے بارہ میں یہ تبصرہ بالکل درست ہے۔ اور بابری مسجد اجودھیا کے نام پر اٹھائی جانے والی تحریک اس کی بدترین مثال ہے۔ ۱۹۸۶ کے بعد مسلمانوں کے نااہل لیڈروں نے جس طرح بابری مسجد تحریک کو چلایا، اس کا خلاصہ یہ تھا کہ انھوں نے اس اشو پر ہندو عوام سے ٹکراؤ کا طریقہ اختیار کیا، اور حکومت کی یہ ذمہ داری سمجھی کہ وہ ان کی طرف سے کافی ہو جائے اور اس معاملہ میں مختار کل بن کر ان کے حق میں فیصلہ دیدے۔ مگر ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے واقعہ نے بتایا کہ یہ مفروضہ سراسر غلط تھا۔ ۱۵ اگست ۱۹۹۲ کی تقریر

ہیں وزیر اعظم ہند نے اعلان کیا کہ وہ بابری مسجد کو ڈھانے نہیں دیں گے۔ دسمبر میں انھوں نے پولیس فورس کی دس کمپنی (۲۰ ہزار سے زیادہ) اجودھیا کی سرحد پر پہنچادیں اور بہت سے دوسرے سرکاری انتظامات کیے۔ مگر عملاً وہی ہوا جو ہندو عوام چاہتے تھے —— ۶ دسمبر کو کارسیوکوں نے اجودھیا میں گھس کر بابری مسجد کو ڈھادیا، انھوں نے اس کا ایک ایک پتھر وہاں سے اٹھاکر دور پھینک دیا۔ اس کے بعد انھوں نے عین اسی جگہ پر ایک عارضی مندر بنا دیا۔ مزید یہ کہ انھیں اس کی بھی عدالتی اجازت مل گئی کہ وہ اس نئے مندر میں رام للا کی مورتیاں رکھ کر اس کا درشن اور پوجا شروع کردیں۔

یہ واقعہ واضح طور پر حکومت کے اوپر عوام کی برتری کا ثبوت ہے۔ وہ آخری طور پر ثابت کر رہا ہے کہ اس ملک میں برتر حیثیت عوام کو حاصل ہے نہ کہ ان افراد کو جو عوام کے ووٹوں سے منتخب ہو کر محدود مدت کے لیے وزارت بناتے ہیں۔ اب عقل و تدبر سے خالی ہی کوئی شخص یہ یقین کر سکتا ہے کہ جو مرکزی حکومت بابری مسجد کے تاریخی ڈھانچہ کو توڑے جانے سے نہ بچا سکی وہ مرکزی حکومت ایسا کر سکتی ہے کہ نئے بنے ہوئے مندر کو بزور توڑے، اس میں نصب شدہ رام کی مورتیوں کو ہٹائے، اور پھر عین اسی جگہ پر دوبارہ بابری مسجد بنا کر کھڑی کر دے۔

مگر حیرت انگیز بات ہے کہ یہ کھلا ہوا واقعہ بھی مسلمانوں کے نااہل لیڈروں کی بے خبری کو توڑ نہ سکا۔ جیسا کہ اخبارات سے معلوم ہو چکا ہے، ۵ اپریل ۱۹۹۳ کو آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے تقریباً ڈیڑھ درجن ممتاز افراد دہلی میں جمع ہوئے۔ انھوں نے اتفاق رائے سے ایک میمورنڈم تیار کیا۔ اس میمورنڈم میں یہ مانگ کی گئی تھی کہ حکومت اجودھیا کے موجودہ عارضی مندر کو اور مورتیوں کو ہٹائے اور بابری مسجد کو اس کی سابقہ جگہ پر دوبارہ تعمیر کرے۔ اس کے بعد یہ وفد وزیر اعظم پی وی نرسمہا راؤ سے ملا اور مذکورہ میمورنڈم کو ان کے حوالے کیا۔

یہ بلاشبہ خلاف زمانہ عمل Anachronism کی بدترین مثال ہے۔ ۶ دسمبر کے واقعہ سے مسلمانوں کو سب سے بڑا سبق یہ لینا چاہیے تھا کہ اب انھیں ہندو عوام کی طرف جانا ہے۔ اب انھیں اپنی کوششوں کا رخ ہندو جنتا کی طرف کرنا ہے نہ کہ دہلی میں بیٹھے ہوئے حکمرانوں کی طرف۔ مگر کیسی عجیب بات ہے کہ مسلمانوں کے نادان رہنما بدستور دہلی کا طواف کرنے میں مشغول ہیں۔

ایسی حالت میں مسلم پرسنل لا بورڈ کے وفد نے یہ ناقابل فہم نادانی کیوں کی کہ انھوں نے وزیر اعظم سے مل کر یہ مطالبہ کیا کہ مندر کو توڑ کر دوبارہ وہاں مسجد بناؤ۔ اس کی واحد وجہ ان کی بے شعوری ہے۔ وہ ابھی تک پچاس سال پہلے والے ہندستان میں سوچ رہے ہیں۔ انھیں معلوم نہیں کہ آج انڈیا میں عوام کی حکومت ہے نہ کہ کسی مطلق العنان بادشاہ کی حکومت۔

اب آخری وقت آگیا ہے کہ مسلمان اپنی اس روش کو بدلیں۔ وہ حکومت یا ایڈمنسٹریشن کی طرف دیکھنے کے بجائے ہندو عوام کی طرف دیکھیں۔ مسلم رہنما ہندو رہنما سے ملیں۔ مسلم عوام اور ہندو عوام میں زیادہ سے زیادہ تعلقات بڑھائے جائیں۔ ہر سطح پر ہندو اور مسلم میل جول کے مواقع پیدا کیے جائیں۔ تاکہ دونوں فرقوں میں ایک دوسرے کے خلاف غلط فہمیاں دور ہوں۔ تاکہ باہمی تناؤ کے حالات ختم ہوں اور دونوں فرقے خوش گوار تعلقات کے ساتھ مل کر رہنے لگیں۔

ڈائیلاگ کی ضرورت

ہمارے مسائل کا حل مسلم۔ حکمراں ملاقات نہیں ہے بلکہ مسلم۔ ہندو ملاقات ہے۔ آج شدید ترین ضرورت ہے کہ کل ہند سطح کا ایک ہندو۔ مسلم ڈائیلاگ منعقد کیا جائے۔ اس میں دونوں فرقوں کے سنجیدہ اور با اثر افراد جمع ہوں۔ اس کا مقصد خالص غیر سیاسی انداز میں امن کی تلاش ہو۔

اس ڈائیلاگ میں دونوں فرقوں کے لوگ کھلے دل کے ساتھ ایک دوسرے کے سامنے اپنی بات رکھیں۔ وہ کوشش کریں کہ باہمی نزاع کی صورت حال ختم ہو اور وہ مشترک بنیاد دریافت کی جائے جس کو اختیار کر کے دونوں فرقے اچھے پڑوسی کی طرح ایک ساتھ رہنے لگیں۔

اس قسم کا ڈائیلاگ اسلامی شریعت کے عین مطابق ہے۔ اسلام کی تاریخ میں حدیبیہ کا واقعہ اسی قسم کا ایک کامیاب ڈائیلاگ تھا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت (۶۲۲ء) کے بعد قدیم عرب میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے تعلقات بہت خراب ہو گئے۔ کئی جنگیں اور جھڑپیں واقع ہوئیں۔ ایک دوسرے کے خلاف نفرت کی دیواریں کھڑی ہو گئیں۔

آخر کار پیغمبر اسلام ؐ نے ۶۲۸ء میں مکہ کے قریب حدیبیہ کے مقام پر تقریباً دو ہفتہ قیام کیا۔ یہاں آپ نے مکہ کے غیر مسلم سرداروں سے گفتگو کی۔ اور پھر ان کی اکثر شرطوں کو مانتے ہوئے

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ایک امن معاہدہ پر دستخط کیے جو کہ اسلام کی تاریخ میں معاہدۂ حدیبیہ کے نام سے مشہور ہے۔

یہ ڈائیلاگ اگر فی الواقع سنجیدگی اور انصاف کے ساتھ کیا جائے تو وہ ہندستان کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوگا۔ انڈیا کی تاریخ آج جہاں رکی ہوئی ہے وہ ہندو۔مسلم تعلقات کا مسئلہ ہے۔ اگر یہ مسئلہ ایک بار حل ہو جائے تو اس کے بعد دونوں فرقوں کے درمیان نارمل تعلقات قائم ہو جائیں گے۔ اور ایسا ہونے کے بعد کوئی بھی دوسری چیز انڈیا کی ترقی کو روکنے والی نہیں۔

ڈائیلاگ کی کامیابی اس پر منحصر ہوگی کہ دونوں فریق ڈائیلاگ کو مناظرہ نہ بنائیں۔ وہ اپنے اپنے فرقہ کے وکیل بن کر نہ بولیں بلکہ یہ سوچ کر بولیں کہ وسیع تر قومی مفاد کس چیز میں ہے، اور ملک کی مشترک بھلائی کا راستہ کیا ہے۔

دونوں فریق کو اپنے آپ سے یہ عہد کرنا ہوگا کہ وہ اشوز اور نان اشوز میں فرق کریں گے۔ وہ کسی معاملہ کو اپنے لیے وقار کا مسئلہ نہیں بنائیں گے۔ وہ کلیم اور کاونٹر کلیم کا طریقہ اختیار نہیں کریں گے۔ وہ جو بھی کہیں گے رزلٹ کو سامنے رکھ کر کہیں گے۔ ان کا انداز غیر جانب داری کا ہوگا نہ کہ طرفداری کا۔ وہ منوانے کے ساتھ ماننے کے لیے بھی تیار رہیں گے۔ وہ دوسرے سے لینا بھی چاہیں گے اور دوسرے کو دینا بھی۔

ڈائیلاگ کوئی حریفانہ میٹنگ نہیں، وہ برادرانہ میٹنگ ہے۔ اس کو ہار جیت کی نفسیات سے اوپر اٹھ کر انجام دیا جاتا ہے۔ اس کا مقصد معاملہ کو سلجھانا ہوتا ہے نہ کہ معاملہ کو الجھانا۔ ڈائیلاگ کے پیچھے مفاہمت کا جذبہ ہونا چاہیے نہ کہ مقابلہ کا جذبہ۔

ڈائیلاگ کا مطلب یہ ہے کہ اختلافی معاملہ کو ٹکراؤ کے بجائے بات چیت کے ذریعہ حل کیا جائے۔ اگر اس اسپرٹ کے ساتھ ڈائیلاگ شروع کیا جائے تو اس کی کامیابی یقینی ہے۔ ہمارے ملک کی ترقی کا دروازہ تقریباً آدھی صدی سے بند پڑا ہوا ہے۔ اور یہ ڈائیلاگ اس بند دروازہ کو یقیناً کھول سکتا ہے، بشرطیکہ اس کو سچی اسپرٹ کے ساتھ انجام دیا جائے۔

نئے عہد کے دروازہ پر

۱۹۴۶ میں جب انڈیا کے بٹوارہ کا فیصلہ ہو گیا تو مہاتما گاندھی نے طے کیا کہ وہ پاکستان جائیں گے۔ یہ سفر ایک مشن کے لیے تھا۔ اور یہ مشن ان کے اپنے الفاظ میں ہندو۔ مسلم دشمنی (Hindu-Muslim antagonism) کو ختم کرنا تھا۔ اس وقت وہ ۷۷ سال کے ہو چکے تھے۔ انھیں کلکتہ سے نواکھلی جانا تھا جو ان کے لیے بے حد مشکل راستہ تھا۔ مگر وہ مشکلات سے بے پروا ہو کر نواکھلی گئے۔ وہاں انھوں نے اپنی یادداشت میں ۵ دسمبر ۱۹۴۶ کو یہ الفاظ تحریر کیے:

> My present mission is the most difficult and complicated one of my life... I am prepared for any eventuality. 'Do or Die' has to be put to the test here. 'Do' here means Hindus and Mussulmans should learn to live together in peace and amity. Otherwise, I should die in the attempt.
>
> (Louis Fischer, *The Life of Mahatama Gandhi*, p.449)

میرا موجودہ مشن بے حد مشکل مشن ہے۔ وہ میری زندگی کا سب سے زیادہ پیچیدہ مشن ہے۔ میں کسی بھی صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ یہ میرے لیے 'کرو یا مرو' کا امتحان ہے۔ کرنے کا مطلب اس وقت یہ ہے کہ ہندو اور مسلمان کو یہ سیکھنا ہوگا کہ وہ امن اور دوستی کے ساتھ باہم مل کر رہیں۔ ورنہ میں اس کی کوشش میں اپنی جان دے دوں گا (صفحہ ۴۴۹)

مہاتما گاندھی نے اس معاملہ کو اتنی زیادہ اہمیت کیوں دی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آزادی کے بعد یہی واحد چیز تھی جس پر ملک کے مستقبل کا انحصار تھا۔ ہندو اور مسلمان دونوں کو یا تو باہم مل کر ترقی کرنا تھا یا دونوں کو برباد ہو جانا تھا۔ بعد کو پیش آنے والے حالات نے مہاتما گاندھی کے اس نظریہ کی مکمل تصدیق کر دی ہے۔

انڈیا میں ہندو۔ مسلم مسئلہ اتنا زیادہ پیچیدہ کیوں بن گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انڈیا کی آبادی میں ہندو ۸۰ فی صد ہیں اور مسلمان ۱۵ فی صد۔ بقیہ فرقے صرف ایک دو فی صد ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان اس ملک میں نکسٹ ٹو مجارٹی (بعد از اکثریت) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور یہ عام سماجی اصول ہے کہ جہاں ایک گروہ مجارٹی میں ہو اور دوسرا گروہ نکسٹ ٹو مجارٹی کا درجہ

رکھتا ہو تو وہاں ایسے دو گروہوں کے درمیان حریفانہ کش مکش کی فضا قائم ہو جاتی ہے۔ دونوں کے درمیان مستقل طور پر فرضی یا حقیقی مسائل چھڑے رہتے ہیں۔

انڈیا میں ہندو اور مسلم مسئلہ کا اصل سبب یہی نزاکت ہے۔ ہندو یہاں مجارٹی میں ہیں اور مسلمان یہاں نکسٹ ٹو مجارٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس طرح کی صورت حال میں یہ مسئلہ ہر سماج میں پایا جاتا ہے۔ اس کے نقصانات سے بچنے کی صورت صرف یہ ہے کہ اس کے بارہ میں لوگوں کو باشعور بنا دیا جائے۔ باشعور آدمی اپنی تعمیری سوچ کی بنا پر ان چیزوں سے اپنے آپ کو بچالیتا ہے جن سے بے شعور آدمی اپنے آپ کو بچا نہیں پاتا۔

دو طرفہ معاملہ

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو اکثریتی فرقہ کے جن لوگوں نے اجودھیا کی بابری مسجد کے ڈھانچہ کو ڈھایا تھا وہ بطور خود سمجھ رہے تھے کہ یہ معاملہ ان کے لیے یک طرفہ معاملہ ہے۔ مگر اس کے بعد ۱۲ مارچ ۱۹۹۳ کو اقلیتی فرقہ کے کچھ ناراض افراد نے جب بمبئی میں تیرہ طاقتور بموں (High-tech bombs) کا بھیانک دھماکہ کر کے ملک کی اقتصادی راجدھانی کو ہلا دیا تو معلوم ہوا کہ یہ معاملہ دو طرفہ ہے۔ پہلا فرقہ اگر دوسرے فرقہ کو نقصان پہنچا سکتا ہے تو دوسرا فرقہ بھی نقصان پہنچانے کے معاملہ میں پہلے فرقہ سے کم نہیں۔ چنانچہ بمبئی کے بم دھماکوں (Bomb blasts) کے بعد آر ایس ایس کے انگریزی ہفت روزہ آرگنائزر (۲۸ مارچ ۱۹۹۳) نے اپنے پہلے صفحہ پر اس کی جو رپورٹ چھاپی ہے، اس کی سرخی بامعنی طور پر یہ قائم کی گئی ہے ——— ہم کتنے محفوظ ہیں:

How safe are we?

اس حقیقت کا اعتراف دوسرے بہت سے مبصرین نے بھی کیا ہے۔ مثال کے طور پر بزرگ صحافی مسٹر کلدیپ نائر (ریڈئنس ۴-۱۰ اپریل ۱۹۹۳) نے بمبئی کے حادثہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ واقعہ ایک چیتاونی ہے کہ اگر آبادی میں ۱۲ فی صد کی تعداد رکھنے والا گروہ تباہ کیا جا سکتا ہے تو ۸۲ فی صد کی تعداد رکھنے والے ہندو بھی نقصان سے محفوظ نہیں رہ سکتے:

It is a warning that if they, the 12 per cent of the population, are sought to be destroyed, the 82 per cent of the Hindus will not stay unhurt.

اس دنیا میں جمہوری طاقت اور تشدد کی طاقت کے درمیان لازمی طور پر کوئی برابری نہیں ہے۔ اکثریت اور اقلیت کے درمیان عددی تناسب کے اعتبار سے یقیناً فرق ہوتا ہے۔ مگر تخریب کاری کی صلاحیت کے اعتبار سے دونوں میں کوئی حقیقی فرق نہیں۔ ایک گروہ جتنی تخریب کاری کر سکتا ہے، دوسرا گروہ بھی یقینی طور پر اتنی ہی یا اس سے زیادہ تخریب کاری کر سکتا ہے۔ اس لیے اب آخری وقت آگیا ہے کہ اس معاملہ پر از سر نو غور کیا جائے اور اس کا کوئی قابل عمل حل تلاش کیا جائے، اس سے پہلے کہ بربادی کی وہ حد آجائے جس کے بعد تلافی کی کوئی صورت باقی نہ رہے۔

اولاً ۶ دسمبر اور اس کے بعد ۱۲ مارچ کے واقعہ کا سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ اس ملک میں ہندو اور مسلمان کا مسئلہ دوگونہ نوعیت کا ایک مسئلہ ہے۔ نتیجہ کے اعتبار سے، وہ دونوں میں سے کسی کے لیے بھی یک طرفہ برتری کا مسئلہ نہیں۔

اس مسئلہ کی سنگینی یہ ہے کہ ہندو اپنی اکثریتی طاقت کی بنا پر مسلمان کے لیے ایک مستقل چیلنج ہے، مسلمان کے لیے ممکن نہیں کہ وہ ہندو سے اس کی یہ حیثیت چھین سکے۔ دوسری طرف مسلمان اپنی تمام تر عددی کمی کے باوجود، یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ وہ ہندو کے لیے ازعاج (nuisance) پیدا کر سکے۔ اور ہندو بھی کسی حال میں مسلمان سے اس کی یہ حیثیت چھیننے پر قادر نہیں۔

اس طرح ہندو اور مسلمان دونوں یکساں طور پر ایک دوسرے کے لیے سامان تشویش (concern) بن گئے ہیں۔ حقیقت پسندی کا تقاضا ہے کہ دونوں ہی ٹھنڈے دل کے ساتھ اس معاملہ پر غور کریں اور دوطرفہ مفاد (mutual interest) کی خاطر اس کا کوئی مستقل حل نکالیں۔ ورنہ اگر یہی حالات باقی رہے تو دونوں اپنے آپ کو تباہ کر لیں گے۔ اس کے بعد دونوں میں سے کوئی بھی ترقی کی منزل تک پہنچنے والا نہیں۔

ڈائیلاگ کی ضرورت

ان حالات میں میری تجویز ہے کہ یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کے نمائندہ افراد کے درمیان ایک موثر قسم کا ڈائیلاگ منعقد کیا جائے۔ اس کا مقصد یہ ہو کہ ہندو۔مسلم جھگڑے کو اس

لک سے ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔ اس ڈائیلاگ میں دونوں فرقوں کے نمائندہ افراد
مع ہوں اور پوری سنجیدگی کے ساتھ باہم تبادلۂ خیال کریں۔ وہ ہمدردی کے جذبہ کے تحت
یک دوسرے کے مسائل کو سمجھیں۔ اس ڈائیلاگ میں وہ اپنے فرقہ کے محدود مفاد سے زیادہ
یش کے عمومی مفاد کو اپنے سامنے رکھیں۔ وہ کھلے دل کے ساتھ ایک دوسرے سے بھائی بھائی کی
ند گفت گو کریں۔

ڈائیلاگ کا طریقہ یہ ہونا چاہیے کہ دونوں فریق حقیقت پسندی اور ملک کے وسیع تر
فاد کو سامنے رکھتے ہوئے گفتگو کا ایک ایجنڈا اختیار کریں۔ اس میں مشترک نوعیت کی بالکل ضروری
تیں درج ہوں۔ یہ ایجنڈا منصفانہ بھی ہو اور فائنل بھی۔ اس ایجنڈے کی بنیاد پر دونوں کے
رمیان سنجیدہ گفت گو ہو۔ اور پھر دو اور لو (Give and take) کے اصول پر تمام باہمی
زاعات کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔

تقریباً یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس ڈائیلاگ کے لیے حالات پوری طرح سازگار
ہو چکے ہیں۔ حالات کی اسی سازگاری سے حوصلہ افزا تاثر لیتے ہوئے ہندستان ٹائمس
(۹ اپریل ۱۹۹۳) نے اپنے اڈیٹوریل میں اس کی موثر وکالت کی ہے۔ اس اڈیٹوریل کا عنوان
ہے —— تحمل کی ضرورت :

Need for restraint

اس سلسلہ میں جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، وہ پوری طرح ڈائیلاگ کے موڈ میں
نظر آتے ہیں۔ انھوں نے جزئی طور پر اس اسپرٹ کا مظاہرہ بھی کیا ہے جو ڈائیلاگ کو کامیابی
تک پہنچانے کے لیے ضروری ہے۔ مثال کے طور پر، بمبئی میں ہندو صاحبان کی یہ مانگ تھی
کہ ہندو محلوں میں واقع مساجد میں رات کے وقت لاوڈ اسپیکر پر اذان نہ دی جائے۔ یا جمعہ
کے دن سڑک کے اوپر نماز ادا نہ کی جائے۔ یہ بات سالہا سال سے چل رہی تھی مگر کوئی فیصلہ
نہیں ہو پاتا تھا۔ ۱۹۹۳ کے آغاز میں دونوں فرقوں کے لوگوں نے اس مسئلہ پر گفتگو کی اور
باہمی رضامندی سے ایک متفقہ فیصلہ کر لیا گیا۔

اس معاملہ میں جہاں تک ہندو صاحبان کا تعلق ہے، اپنے مذہب کے زیر اثر ان کا

مزاج عام طور پر روادار رہا ہے۔ تاہم بھارتیہ جنتا پارٹی کے عروج کے بعد ہندوؤں کے ایک طبقہ میں کسی قدر جارحانہ مزاج پیدا ہو گیا تھا جو کامیاب ڈائیلاگ کے راستہ میں رکاوٹ تھا۔ مگر ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے بعد سامنے آنے والے حالات نے انھیں اپنے رویہ پر نظر ثانی کے لیے مجبور کر دیا ہے۔ اب ان کے اندر بھی وہ حقیقت پسندی آگئی ہے جو ڈائیلاگ کی کامیابی کے لیے ہمیشہ ضروری ہوتی ہے۔ اپریل ۱۹۹۳ کے دوسرے ہفتہ میں بھارتیہ جنتا پارٹی کی نیشنل ایگزیکیٹو کی میٹنگ (کلکتہ) بھی اس معاملہ میں ایک حوصلہ افزا مثال ہے۔ کیوں کہ اس میٹنگ میں پارٹی کے اعلیٰ ذمہ داروں نے طے کیا ہے کہ وہ ٹکراؤ اور جارحیت کے طریقہ کو چھوڑ کر امن اور مفاہمت کے اصول پر اپنی تحریک چلائیں گے۔

آخری چارۂ کار

اس ہندو۔مسلم ڈائیلاگ کو اس عزم کے ساتھ منعقد ہونا چاہیے کہ اس کو بہر حال نتیجہ خیز بنانا ہے۔ اس کو کسی بھی حال میں "نشستند و گفتند و برخاستند" کا مصداق نہیں ہونے دینا ہے، اور اگر عزم صحیح ہو تو ایسا ہونا کچھ بھی مشکل نہیں۔

اس ڈائیلاگ کا پہلا مطلوب نشانہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے دونوں فرقے ایک مشترک اتفاق نامہ تک پہنچ جائیں۔ اگر ایسا ہو تو بلاشبہ یہ پوری ہندستانی قوم کے لیے نہایت خوش قسمتی کی بات ہوگی، اور ہم سب کو اس کے حق میں خدا سے اسی کی دعا کرنا چاہیے۔

لیکن بالفرض اگر اس سے اس قسم کا مثبت نتیجہ برآمد نہ ہو، اور ڈائیلاگ کی کارروائی بتائے کہ دو طرفہ بنیاد پر اس مسئلہ کا حل نکلنے والا نہیں ہے۔ تو ایسی صورت میں آخری چارہ کار کے طور پر میں اپنے مسلم بھائیوں سے کہوں گا کہ وہ اپنے پیغمبر کے اسوہ پر عمل کرتے ہوئے اس کے لیے تیار ہو جائیں کہ وہ یک طرفہ بنیاد پر اس مسئلہ کو ختم کر دیں گے تاکہ ملک میں امن و امان قائم ہو، اور اس خطۂ ارض میں بسنے والے تمام لوگ معتدل حالات میں زندگی گزارنے کا موقع پا سکیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے تیرہ سالہ دعوتی عمل کے بعد مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی۔ مگر اس ہجرت کے بعد بھی ایسا نہ ہو سکا کہ دونوں فریق کے درمیان جھگڑا ختم ہو جائے اور اہل عرب

و پُرامن زندگی کے مواقع حاصل ہوجائیں۔ حتیٰ کہ معاملات اس نوبت کو پہنچ گئے کہ بالکل ظاہر ہوگیا کہ یہ نزاع دوطرفہ بنیاد پر ختم ہونے والی نہیں ہے۔ اس وقت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے حریف طبقہ کی تمام شرطوں کو مانتے ہوئے یک طرفہ بنیاد پر اس نزاع کا خاتمہ کردیا۔ ختم نزاع کا یہی وہ عمل ہے جس کو اسلام کی تاریخ میں صلح حدیبیہ کہا جاتا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ کے وقت اعلان کیا تھا کہ قریش (فریق مخالف) آج مجھ سے جس چیز کے لیے بھی کہیں گے جس میں کہ قرابت داری پائی جاتی ہو تو وہ چیز ضرور میں انھیں دوں گا (لاتدعونی قریش الیوم الی خطة یسألوننی فیها صلة الرحم الا اعطیتهم ایاها) سیرۃ ابن ہشام ۳/۳۵۸

میرا مشورہ ہوگا کہ ایسی صورت میں مسلمان اس اسوۂ رسول کی اسپرٹ پر عمل کرتے ہوئے برادران وطن سے یہ کہہ دیں کہ ملک میں شانتی لانے کی خاطر ہم ہر اس شرط کو ماننے کے لیے تیار ہیں جس سے انڈیا کا وقار اور اس کی اعلیٰ روایتیں باقی رہتی ہوں، جو دیش کی مجموعی ترقی کا راستہ کھولنے والا ہو۔

مسلمان بھائیوں کے اطمینان کے لیے مزید میں کہوں گا کہ اس طرح کا تصفیہ ہمیشہ وقتی ہوتا ہے، وہ کبھی بھی مستقل یا ابدی نہیں ہوتا۔ مسلمان اگر اس معاملہ میں یک طرفہ ایڈجسٹمنٹ پر راضی ہوجائیں تو وقتی طور پر بظاہر یہ ان کے لیے کھونے کا واقعہ دکھائی دے گا۔ مگر عین ممکن ہے کہ مستقبل کے لحاظ سے وہ ان کے لیے نئی، زیادہ بڑی کامیابی کا دروازہ کھولنے کے ہم معنی بن جائے۔

دو مثالیں

اس کی عملی مثالیں قریب کی تاریخ میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد امریکہ (اور اس کے حلیفوں) نے جرمنی کو مختلف حصوں میں تقسیم کرکے اس کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا۔ اسی طرح امریکہ کی فوجیں جاپان کی سرزمین پر اتر گئیں۔ اور جنرل میکارتھر نے جاپانی قوم کے لیے ایک نیا دستور تیار کیا جس میں یہ لکھا ہوا تھا کہ جاپان آئندہ کبھی بھی اور کسی اعتبار سے بھی فوجی طاقت بننے کی کوشش نہیں کرے گا۔ (10/87)

جرمنی اور جاپان کے مدبروں نے محسوس کیا کہ اب ان کے لیے دو میں سے ایک انتخاب ہے۔ یا تو وہ امریکہ اور اس کے حلیفوں سے جنگ جاری رکھیں اور اس کے نتیجہ میں بدستور تباہ ہوتے رہیں۔ یا یک طرفہ طور پر وہ فریق ثانی کی شرطوں کو مان لیں۔ انھوں نے پہلے انتخاب کو چھوڑ کر دوسرے انتخاب کو لے لیا۔

یہ بظاہر یک طرفہ ایڈجسٹمنٹ تھا۔ مگر اس کا نتیجہ اتنا بڑا نکلا کہ چالیس سال کے اندر تاریخ بدل گئی۔ جرمنی ہمیشہ سے زیادہ طاقت ور ہو کر دوبارہ متحد ہو گیا۔ اسی طرح جاپان بھی پہلے سے زیادہ ترقی یافتہ ہو کر اس حالت میں آگیا کہ وہ خود امریکہ کو دفاعی پوزیشن میں ڈال دے۔

یک طرفہ ایڈجسٹمنٹ کوئی ہار کا معاملہ نہیں۔ قرآن (الفتح ۱) کے مطابق، وہ عین جیت کا معاملہ ہے۔ یک طرفہ ایڈجسٹمنٹ اپنے پہلے روز ہی فریق ثانی کے اوپر اخلاقی فتح ہے۔ اور اگر مزید دانش مندی کا ثبوت دیا جائے تو بعد کے مرحلہ میں مادی فتح بھی۔

یہاں ایک اضافہ بہت سبق آموز اور بہت بامعنی ہے۔ آر ایس ایس کے ہفتہ وار انگریزی میگزین آرگنائزر (دہلی) نے اپنے شمارہ ۲۵ اپریل ۱۹۹۲ میں ایک مفصل مضمون شائع کیا ہے۔ راقم الحروف کی تجویز ہندو۔ مسلم ڈائیلاگ کے بارہ میں ہے۔ تجویز کے تعارف اور تبصرہ کے بعد آخر میں اس نے کسی قدر طنزیہ انداز میں لکھا ہے :

Thus a Muslim leader, however well-meaning and well-intentioned in quest of peace, must search for a precedent in Hadis for talks with the non-Muslims. But then everybody knows the fate of Hudaibia agreements which proved only a convenient truce to bale them out of a difficult situation, for a total conquest of Mecca ultimately (p.14).

انڈیا آج ایک نئے عہد کے دروازہ پر کھڑا ہے۔ آج اہل ملک کو، خاص طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں کو، ایک نیا تاریخی فیصلہ کرنا ہے۔ اگر دونوں یہ تاریخی فیصلہ لینے میں کامیاب رہے تو دیش کامیاب ہو گا۔ اور اگر دونوں یہ تاریخی فیصلہ لینے میں ناکام ہو گئے تو اس کے بعد دیش کے لیے تباہی اور بربادی کے سوا کوئی اور مستقبل نہیں۔

قیادت کا خلا

قومی پریس میں آج کل مسلسل ایسے مضامین اور ایسی رپورٹیں چھپ رہی ہیں جن میں ملک کے مستقبل کے بارہ میں سخت تشویش کا اظہار ہوتا ہے۔ ہندستان ٹائمس (۱۲ اپریل ۱۹۹۳) میں مسٹر ایس ایس گل کا ایک آرٹیکل چھپا ہے، اس کا عنوان بمبئی کے بعد (Beyond Bombay) ہے۔ مضمون نگار نے ملک کی موجودہ ابتری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> In modern times India has never before faced such a threat to its integrity and its very existence as a nation state. And we have never been so ill-equipped to face this challenge. The maladies are known, the remedies are known, but the physician is missing.

عہد حاضر میں انڈیا کو اپنے استحکام اور قومی ریاست کی حیثیت سے اپنے وجود کے لیے کبھی ایسا خطرہ پیش نہیں آیا تھا۔ اور ہم اس چیلنج کا سامنے کرنے کے لیے کبھی اتنے بے مایہ نہ تھے۔ مصیبتیں معلوم ہیں، ان کا علاج بھی معلوم ہے، مگر ڈاکٹر موجود نہیں (صفحہ ۱۳)

یہ قیادت کے خلا کا مسئلہ ہے، مسلمان اس خلا کو پُر کر سکتے ہیں۔ مگر اس طرح نہیں کہ وہ کسی شاعرانہ کلام کے حوالے سے اپنے کو محتسب کائنات ثابت کریں۔ یا یہ اعلان کریں کہ ہم خیر الامم ہیں، اس لیے ہمیں ساری دنیا پر حکمرانی کا حق حاصل ہے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ قیادت صبر کی قیمت پر ملتی ہے (وجعلنا منهم ائمة يهدون بامرنا لما صبروا) اس وقت جو صبر درکار وہ یہ کہ مسلمان ماضی کی تلخیوں کو بھلائیں۔ برادران وطن کی زیادتیوں پر مشتعل ہونا ترک کریں۔ وہ مانگنے کے بجائے دینے والے بنیں۔ وہ ملی وقار کو اشو بنانے کے بجائے انسانی خدمت کو اشو بنائیں۔ وہ تمام نزاعات کو یک طرفہ بنیاد پر ختم کرنے کے لیے راضی ہو جائیں۔ وہ دوسری قوموں کے حریف بننے کے بجائے ان کے خیر خواہ بن جائیں۔ وہ اپنی تصویر یہ بنائیں کہ وہ حقوق کے لیے اٹھنے والے لوگ نہیں ہیں بلکہ ذمہ داریوں کو پورا کرنے والے لوگ ہیں۔

یہی صبر قیادت کی لازمی شرط ہے۔ مسلمان اگر اس شرط کو پورا کر دیں تو قیادت ان کی طرف اس طرح دوڑ کر آئے گی جس طرح ڈھلوان کی طرف سیلاب کا پانی۔

حج اسپرٹ

۱۹۸۲ میں میں نے حج کا فریضہ ادا کیا تھا۔ جن دنوں میں مکہ میں تھا، میری ملاقات کچھ عرب نوجوانوں سے ہوئی۔ ان نوجوانوں کا تعلق ایک خاص جماعت سے تھا جو کہ اسلامی انقلاب کی حامی ہے۔ اور مختلف مسلم ملکوں میں پر تشدد تحریک چلا رہی ہے۔ یہ نوجوان تعلیم یافتہ حاجیوں کے درمیان خفیہ طور پر کچھ عربی لٹریچر تقسیم کر رہے تھے۔ مجھے بھی انھوں نے اپنا ایک سٹ دیا۔ میں نے اس کو پڑھا تو معلوم ہوا کہ اس میں مسلح اسلامی انقلاب کی تبلیغ کی گئی تھی۔

اس قسم کے پروپگنڈے کا سلسلہ آج بھی مزید اضافہ کے ساتھ جاری ہے۔ غور کیجئے کہ ایسا کیوں ہے۔ حرم کا علاقہ وہ علاقہ ہے جہاں انسان کی جان لینا تو درکنار، جانوروں تک کو مارنا جائز نہیں۔ پھر ایسے محترم مقام پر کیوں ایسا لٹریچر پھیلایا جاتا ہے جو تشدد کے فلسفہ پر مبنی ہو، جس میں کچھ لوگوں کو دشمن اسلام کا لقب دے کر انھیں مارنے اور ہلاک کرنے پر ابھارا گیا ہو۔

قرآن میں مکہ کو بلد آمن (ابراہیم ۲۵) کہا گیا ہے، یعنی امن کا شہر۔ مکہ کی مقدس مسجد کو حرم آمن (العنکبوت ۶۷) اور بیت امن (البقرہ ۲۵) بتایا گیا ہے، یعنی امن کا گھر، امن وسلامتی کا مرکز۔ یہ امن وسلامتی حرم کی نہایت ابھری ہوئی حیثیت ہے۔ اس لیے حاجیوں کے اوپر سب سے زیادہ نمایاں اثر بھی اسی کا ہونا چاہیے۔ مگر عملی صورت حال اس کے برعکس ہے۔

آج حاجیوں کی تعداد ہمیشہ سے زیادہ ہوتی ہے۔ ساری دنیا سے ہر سال تقریباً تین ملین مسلمان حج کی ادائیگی کے لیے مکہ پہنچتے ہیں۔ مگر عین اس وقت سارے مسلم علاقوں میں پر تشدد تحریکیں جاری ہیں۔ حج کے اضافہ نے تشدد کے واقعات کو کم نہیں کیا۔ حاجیوں نے ابھی تک اپنے حج سے امن وسلامتی کا سبق نہیں لیا۔ حاجیوں کا قافلہ ہر سال اس لیے حرم مکہ جاتا ہے کہ وہ وہاں سے واپس آکر اس کی توسیع بنے، وہ ساری دنیا میں حرم کی خصوصیاتِ امن کو پھیلا دے۔ مگر فیوض حرم کی یہ توسیع ابھی تک ممکن نہ ہو سکی۔

اس کا سبب شاید یہ ہے کہ لوگ حج کی حقیقت کو بھول گئے ہیں۔ آج کے لوگ حج کی صورت سے واقف ہیں۔ مگر وہ حج کی اسپرٹ سے واقف نہیں۔ حج کے مقام کو جب قرآن

میں امن وسلامتی کا مقام کہا گیا ہے تو اسی سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حج کی اسپرٹ کیا ہے۔ حج کی اسپرٹ وہ اعلیٰ روحانیت ہے جو تمام بنی آدم کو ایک ہی انسانی روپ میں دیکھنے لگے۔

حج کی اسپرٹ امن ہے، جنگ نہیں۔ حج کی اسپرٹ محبت ہے، نفرت نہیں۔ حج کی اسپرٹ نرمی ہے، تشدد نہیں۔ حج کی اسپرٹ رحمت ہے، زحمت نہیں۔ مگر عجیب بات ہے کہ حج کی یہی خصوصیت آج مسلمانوں میں کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ حج کی یہ خصوصیت کہیں بھی موجودہ مسلمانوں کی قومی پالیسی کا جزء نہ بن سکی۔

لوگ حج کی ظاہری شکل کو دہرا کر سمجھتے ہیں کہ انھوں نے حج کر لیا۔ حالانکہ حقیقی حج اس شخص کا ہے جو حج کو اس کی مثبت روح کے ساتھ ادا کرے۔ آج مکہ میں ہمیشہ سے زیادہ حاجیوں کی بھیڑ ہوتی ہے۔ اسی کے ساتھ مسلمان ساری دنیا میں اپنے مفروضہ دشمنوں کے خلاف لڑائی چھیڑے ہوئے ہیں۔ یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اگر مسلمان سچی اسپرٹ کے ساتھ حج کر کے لوٹیں تو اچانک ساری دنیا میں امن کی فضا قائم ہو جائے۔ اس کے بعد مسلمان نہ صرف خود تشدد کرنا یا تشدد کی بات بولنا چھوڑ دیں، بلکہ وہ تمام لوگوں کے سامنے امن اور سلامتی کے مبلغ بن جائیں۔

آج ضرورت ہے کہ بیت حرم میں جانا مسلمان کے لیے بیت امن میں جانا بن جائے۔ وہاں جمع ہو کر تمام مسلمان توبہ و استغفار کریں۔ وہ ہر قسم کے تشدد کو چھوڑنے کا عہد کریں، خواہ وہ تشدد اسلام کے نام پر ہو یا کسی اور نام پر۔ حج کی عبادت سے وہ یہ عزم لے کر لوٹیں کہ وہ تشدد کے ہر طریقہ کو یک طرفہ فیصلہ کے تحت ختم کر دیں گے۔ وہ ساری دنیا کے لیے امتِ رحمت بن جائیں گے جس طرح ان کا نبی ساری دنیا کے لیے نبیِ رحمت بنا ہوا تھا۔

آج کی دنیا جنگ اور تشدد سے آخری حد تک اکتا چکی ہے۔ آج کی دنیا کو "مصلحانہ جنگ" سے بھی اتنی ہی نفرت ہے جتنی مفسدانہ جنگ سے۔ آج دنیا کو ایسے مذہب کی تلاش ہے جو اس کو تشدد کی آگ سے نکالے اور اس کو امن کی ٹھنڈک عطا کرے۔ حج ایسے ہی داعیانِ امن کی تربیت ہے۔ حقیقی حاجی وہ ہے جو امن کی تربیت سے فیض یاب ہو کر وہاں سے لوٹے۔ جس کے لیے حج تربیت گاہِ امن میں جانے کے ہم معنی بن جائے۔ یہی لوگ دوبارہ انسانیت کے اوپر رحمتِ خداوندی کا دروازہ کھولیں گے، وہ دروازہ جو صدیوں سے ان کے اوپر بند پڑا ہوا ہے۔

غلطی کی تصحیح

میری ملاقات یوپی کے ایک ہندو نوجوان سے ہوئی۔ وہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو اجودھیا میں موجود تھے جب کہ وہاں بابری مسجد کو ڈھایا گیا اور اس کی جگہ ایک عارضی مندر کی تعمیر کی گئی۔ میں نے پوچھا کہ آپ لوگوں نے ایسا کیوں کیا۔ انھوں نے کہا کہ بھارت کی پچھلی تاریخ میں کچھ غلطیاں ہوئی ہیں، ان غلطیوں کو ہمیں درست کرنا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ نے اپنے خیال کے مطابق، ۶ دسمبر کو ایک بڑی غلطی کی تصحیح کر دی۔ اب بتائیے کہ اس تصحیح سے دیش کا کتنا کلیان ہوا۔ لوگوں کے دکھوں میں کتنی کمی واقع ہوئی۔ خود آپ نے اپنی زندگی میں ترقی کی کتنی اور سیڑھیاں طے کیں۔ وہ میرے اس سوال کے جواب میں کوئی متعین بات نہ بتا سکے۔

پھر میں نے کہا کہ میرے بھائی، اگر آپ دیش کی غلطیوں کو درست کرنا چاہتے ہیں تو یہاں اور بھی زیادہ بڑی بڑی غلطیاں موجود ہیں، ان کو درست کیجئے۔ اجودھیا کی مسجد صحیح بنی تھی یا غلط، یہ تو ایک ایسا تاریخی مسئلہ ہے جو ابھی طے نہیں ہوا۔ مگر یہاں اور بہت سی بھیانک غلطیاں ہیں جن کا غلط ہونا مسلّم ہے، پھر آپ ان کو درست کرنے میں اپنی طاقت کیوں نہیں لگاتے۔ میں نے کہا کہ ہمارا دیش ۱۹۴۷ میں آزاد ہوا۔ مگر وہ دوبارہ اقتصادی غلامی میں جکڑ گیا۔ آپ دیش کو اقتصادی غلامی سے نکالنے اور اس کو سچی آزادی میں سانس لینے کا موقع دیجئے۔ ایک وقت تھا کہ بھارت ایک مہان دیش سمجھا جاتا تھا۔ آج عالمی نقشہ میں بھارت صرف ایک پچھڑا ہوا دیش بن گیا ہے۔ آپ دوبارہ بھارت کو اس کا کھویا ہوا مقام واپس دلائیے۔

پہلے بھارت اپنی اعلیٰ روایات کے لیے مشہور تھا۔ آج وہ تمام روایتیں ٹوٹ چکی ہیں۔ آپ ان اعلیٰ روایتوں کو دیش میں دوبارہ قائم کیجئے۔ پہلے دیش کے اندر قانون کا احترام پایا جاتا تھا۔ آج یہاں ہر طرف لاقانونیت پھیلی ہوئی ہے۔ آپ اس لاقانونیت کو ختم کر کے قانون کا دور واپس لائیے۔ پہلے ہمارا دیش اپنی خوش حالی کے لیے مشہور تھا۔ آج یہاں کی آبادی غریبی کا شکار ہو رہی ہے۔ آپ اس غریبی کو مٹا کر اس کو دوبارہ خوش حال بنائیے۔ درست کرنے والوں کو چاہیے کہ وہ ان غلطیوں کو درست کریں نہ کہ فرضی غلطیوں کو جس سے دیش کا کچھ بھلا ہونے والا نہیں۔

ایک سفر

پونہ میں مسیحی چرچ کے تحت ایک بہت بڑا ادارہ De Nobili College ہے۔ اس کے تحت ایک مذہبی مطالعہ کا ادارہ Institute for the Study of Religion قائم ہے۔ اس ادارہ نے ایک امریکی ادارہ کے تعاون سے پونہ میں ۲ - ۶ نومبر ۱۹۹۱ کو ایک کل مذاہب کانفرنس منعقد کی۔ اس کانفرنس کی تھیم تھی: "ریلیجن اینڈ سوسائٹی" اس کانفرنس کی دعوت پر پونہ کا سفر ہوا اور اس کے بعد بمبئی وغیرہ کا سفر۔ ذیل میں اس کی روداد درج کی جاتی ہے۔

۲ نومبر کو گھر سے نکل کر ایرپورٹ کی طرف روانہ ہوا تو انسانی تاریخ کا نقشہ میرے ذہن میں گھومنے لگا۔ موجودہ زمانہ میں سفر کی صورت یہ ہوتی ہے کہ آدمی اپنے گھر سے نکلتا ہے۔ وہ سواری پر بیٹھ کر پختہ سڑکوں سے گزرتا ہوا اسٹیشن یا ایرپورٹ پہنچتا ہے۔ وہاں اس کے لئے ایک اور سواری موجود ہوتی ہے جو اس کو لیکر تیزی سے آگے روانہ ہوتی ہے اور اس کو اس کی منزل تک پہنچا دیتی ہے۔ منزل پر دوبارہ یہی سارے انتظامات ہوتے ہیں جن کو استعمال کر کے وہ اپنے آخری مطلوب مقام پر پہنچ جاتا ہے۔

چند ہزار سال پہلے انسانی زندگی اس سے بالکل مختلف تھی۔ انسان نیم حیوانات کی طرح جنگلوں میں رہتا تھا۔ اس کے بعد دھیرے دھیرے ترقی شروع ہوئی۔ یہاں تک کہ شہری زندگی کا وہ دور آگیا جس کو مدنیت (Urbanization) کہا جاتا ہے۔ مسلم عہد سے پہلے یہ رفتار بہت سست تھی۔ مسلم عہد میں انسانی تہذیب نہایت تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھی۔ آٹھویں صدی عیسوی میں مسلمانوں نے بغداد کی جس طرح تعمیر کی وہ ماضی کے شہروں سے اتنا مختلف ہے کہ شہری تاریخ میں وہ ایک چھلانگ معلوم ہوتا ہے۔

اربن پلاننگ کے پروفیسر ایگلی (Ernst Arnold Egli) نے اس کی توجیہہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ قرآن میں جنت کی زندگی اور جنت کے مکانات کا جس طرح بار بار ذکر کیا گیا ہے، اس نے مسلمانوں کے اندر عمدہ مکانات اور اعلیٰ تمدن کے بارہ میں ایک خیالی تصویر (dream image) بنائی۔ انھوں نے اس خیالی تصویر کو واقعہ بنانے کی کوشش کی۔ اس کے نتیجہ میں مسلم دنیا کے جدید شہر وجود میں آگئے (EB-18/1071)

مسلم تاریخ کے ان واقعات کو مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے عام طور پر قومی فخر کے انداز میں بیان کرتے ہیں۔ وہ اس کو مسلمانوں کے پرفخر کارنامہ کے خانہ میں ڈالے ہوئے ہیں۔ حالاں کہ ان کو آلاء اللہ کے طور پر بیان کیا جانا چاہئے۔

اس دنیا کی ہر ترقی اصلاً امکانات قدرت کو ظہور میں لانے کا نام ہے۔ انسان ان امکانات کو ایجاد کرنے والا نہیں، وہ صرف ان کو استعمال کرنے والا ہے۔ جب ایسا ہے تو ہم کو چاہئے کہ ان ترقیوں کو دیکھ کر ہم خدا کے گیت گائیں نہ کہ ان کو خود اپنے خانہ میں ڈال کر فخر اور ناز کرنے لگیں۔

گھر سے دہلی ایرپورٹ جاتے ہوئے راستہ میں ایک معاملہ پیش آیا۔ اس میں ایک بہت بڑا سبق تھا۔ میں نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہا: لوگوں کے درمیان کامیاب زندگی گزارنے کا واحد آسان طریقہ یہ ہے کہ آپ ان کی انا سے نہ ٹکرائیں۔ اگر آپ اس راز کو جان لیں تو آپ اپنے دشمنوں کے درمیان بھی دوست کی طرح رہ سکتے ہیں۔

دہلی ایرپورٹ پر ڈاکٹر اقتدار حسین صدیقی سے ملاقات ہوئی۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر ہیں۔ ان کی کئی کتابیں چھپ چکی ہیں۔ ان کی ایک کتاب کا نام یہ ہے:

Islam and Muslims in South Asia: Historical Perspective

ان سے دیر تک مختلف علمی موضوعات پر گفتگو ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ آجکل میں مسلمانوں کی فکری تاریخ پر ایک کتاب کی تیاری کر رہا ہوں۔ اس سلسلہ میں میں نے ان سے پوچھا کہ اقبال کی کتاب Reconstruotion of Religious Thought in Islam کے بارہ میں آپ کی کیا رائے ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے اس کو پڑھا ہے۔ وہ ایک اچھی کتاب ہے۔ مگر میں اقبال کے بعض نظریات سے متفق نہیں۔ میں نے مثال پوچھی تو انھوں نے کہا کہ مثلاً اقبال کے مرد کامل (Perfect man) کے نظریہ سے مجھے اتفاق نہیں ہے۔ وہ تاریخ کو ایک ارتقائی عمل کے طور پر دیکھتے ہیں۔ اس کے مطابق ان کا کہنا ہے کہ پرفکٹ انسان مستقبل میں پیدا ہوگا۔ یہ تصور اسلام کے عقیدۂ رسالت سے ٹکراتا ہے۔ کیوں کہ عقیدۂ رسالت کے مطابق، کامل اور پرفکٹ انسان پیغمبر کی صورت میں پیدا ہو چکا۔ اب مسئلہ پرفکٹ مین کی پیروی کرنے کا ہے نہ کہ پرفکٹ مین کا انتظار کرنے کا۔

ایرپورٹ کی کھڑکی پر اپنا بورڈنگ کارڈ لیتے ہوئے ایک واقعہ گزرا۔ اس کے بعد مجھے اسی قسم

کا ایک قصہ یاد آگیا جو میں نے کسی اخبار میں پڑھا تھا۔ ایک انگلش مین ایک بار کسی ایرلائن کے رزرویشن کاونٹر پر کھڑا ہوا تھا۔ اتنے میں ایک موٹی عورت تیزی سے چلتی ہوئی کھڑکی کی طرف بڑھی۔ اس کا ٹکٹ فرسٹ کلاس کے لئے تھا۔ مگر کلرک نے غلطی سے اس کو عام درجہ کا بورڈنگ پاس دے دیا تھا۔ عورت دوبارہ ہجوم کر کے کھڑکی پر پہنچی اور اپنا بورڈنگ پاس درست کر اکے فاتحانہ واپس ہوئی۔

عورت سے دھکا لگنے کی بنا پر لائن میں کھڑے ہوئے انگریز کا ٹکٹ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا تھا۔ اس نے جھک کر اپنا ٹکٹ زمین سے اٹھایا اور سنجیدگی کے ساتھ خاتون سے کہا کہ میڈم، فرسٹ کلاس بورڈنگ پاس کا نام نہیں۔ فرسٹ کلاس ایک طریق زندگی ہے۔

Madam, first class is not a boarding pass.
It is a way of life.

دہلی سے پونہ کے لئے انڈین ایرلائنز کی فلائٹ نمبر ۴۴۹ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ جہاز کے اندر پڑھنے کے لئے انگریزی اور ہندی میں مختلف چیزیں موجود تھیں۔ ان میں سے ایک صنعتی میگزین (Industrial Products Finder) تھا۔ یہ اس کا شمارہ اکتوبر ۱۹۹۱ تھا۔ ۲۳۲ صفحہ کے اس میگزین کے چار حصے تھے:

1. Industrial News Briefs
2. Commercial Info Exchange
3. Technical Articles
4. Product Index

یہ میگزین بزنس پریس (Business Press) کی طرف سے شائع ہوتا ہے جس کا ہیڈ آفس بمبئی میں ہے۔ پورا میگزین صنعتی خبروں یا صنعتی سامانوں کے اشتہار سے بھرا ہوا تھا۔ عنوان نمبر ۲ کے تحت بہت سے لوگوں کی طرف سے یہ اعلان تھا کہ ہم فلاں صنعتی شعبہ سے دلچسپی رکھتے ہیں اور ایسے لوگوں سے ربط (contact) قائم کرنا چاہتے ہیں جو اس شعبہ میں ہم سے تعاون کریں یا فنی جانکاری (Technical know-how) دے سکیں۔

میں نے سوچا کہ مادی شعبوں میں لوگ دوسروں کا تعاون تلاش کر رہے ہیں۔ اور دینی شعبوں میں یہ حال ہے کہ دوسروں سے کٹ کر ہر آدمی اپنی الگ دنیا بنانا چاہتا ہے۔ اس فرق کا سبب کیا ہے۔

اس پر غور کرتے ہوئے میری سمجھ میں آیا کہ اس کا سبب یہ ہے کہ صنعت کار کا بنیادی مقصد کاروبار کو بڑھانا ہوتا ہے اور مذہبی رہنماؤں کا بنیادی مقصد شخصیت کو بڑھانا۔

چڑیوں کو بالائی فضا میں اڑتے ہوئے دیکھ کر قدیم زمانہ سے انسان یہ خواہش کرتا رہا ہے کہ وہ فضا میں اڑے۔ قدیم اسپین میں ایک مسلمان عباس بن فرناس (م ۸۸۸ ء) تھا۔ اس کے اندر نئی نئی چیزیں ایجاد کرنے کا شوق تھا۔ اس نے خاص طرز کی ایک بڑی سی چادر بنائی اور پھر چھتری کی مانند اس میں اپنے آپ کو باندھا اور بلندی پر چڑھ کر فضا میں چھلانگ لگائی۔ تھوڑی دور جاکر وہ زمین پر گر پڑا۔ اس کے دونوں بازو ٹوٹ گئے۔ کہا جاتا ہے کہ کچھ لوگوں نے اس کا معاملہ قاضی سلیمان بن اسود الغافقی کی عدالت میں پیش کیا۔ قاضی نے اس کو غیر معتدل قرار دے کر حکم دیا کہ آئندہ وہ اس قسم کے تجربات نہ کرے۔

احمد شریف الرفاعی کا مضمون (المدینۃ ۱۹ اکتوبر ۱۹۸۹) نظر سے گزرا۔ موصوف نے لکھا تھا کہ اگر عباس بن فرناس پر روک نہ لگائی جاتی تو یقیناً ہم ہوا بازی کے طریقہ کو ہزار سال پہلے جان لیتے۔ (لقد اعدموہ علمیاً ... ولو ترکوہ لشأنہ لعرفنا الطیران قبل اکثر الف سنۃ)

عرب مضمون نگار نے اپنا یہ مضمون "من شرفات التراث" کے عنوان کے تحت شائع کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس حقیقت کو نہ جان سکے کہ ہوائی جہاز کا بننا طویل علمی تحقیق اور بے شمار تجربات کے بعد ممکن ہوا ہے۔ اس میں پوری انسانیت کا سفر شامل ہے۔ وقت کی حکومت اگر عباس بن فرناس کے لئے ساری سہولتوں کا ڈھیر لگا دیتی تب بھی یہ ناممکن تھا کہ جو ہوائی مشین بیسویں صدی میں بنی، وہ اچانک نویں صدی میں بن کر تیار ہو جاتی۔

میرے ساتھ بار بار ایسا پیش آیا ہے کہ میں ٹکٹ کے باوجود سفر نہ کر سکا۔ مثلاً ایک بار میرے پاس لمبے عالمی سفر کا ٹکٹ تھا۔ کسی وجہ سے مجھے اپنے سفر کو مختصر کرنا پڑا۔ میں نے ٹکٹ کی بچی ہوئی رقم کا واؤچر بنوا لیا جو اس کے بعد کئی سفروں میں کام آیا۔

آخر میں میرے پاس دہلی۔ بمبئی کا ریٹرن ٹکٹ تھا۔ اس ٹکٹ کو دوبارہ رقم کی صورت میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ صرف سفر ہی میں اس کو استعمال کرنا ممکن تھا۔ مگر بار بار ایسے حالات پیش آئے کہ میں بمبئی کا سفر نہ کر سکا۔ یہاں تک کہ ٹکٹ کی مدت آخری طور پر ختم ہو گئی، اور وہ استعمال کے قابل

نہ رہا۔

تھوڑی دیر کے لئے احساس ہوا کہ ایک ٹکٹ بلاوجہ ضائع ہوگیا۔ مگر جلد ہی میرے اندر ایک نیا احساس جاگ اٹھا۔ میری زبان سے نکلا "خدایا، میں اس ٹکٹ کو دنیا کے سفر کے لئے استعمال نہ کرسکا۔ تو اپنی رحمت سے اس کو میرے لئے آخرت کا ٹکٹ بنا دے"۔ اس کے بعد نقصان کا احساس جاتا رہا اور دل میں ایک قسم کا سکون پیدا ہوگیا۔

جہاز دہلی سے روانہ ہو کر منزل کی طرف پرواز کرنے لگا۔ وہ رکے بغیر مسلسل اڑ رہا تھا۔ گھڑی کی سوئی بھی برابر آگے بڑھ رہی تھی۔ یہاں تک کہ روانگی کے ٹھیک ایک گھنٹہ اور ۵۰ منٹ پر اناؤنسر نے اعلان کیا کہ اب ہم پونہ کے ہوائی اڈہ پر اترنے والے ہیں۔

میں نے یہ الفاظ سنے تو مجھے محسوس ہوا جیسے اناؤنسر یہ کہہ رہا ہو کہ جہاز کے پرواز کی آخری حد آگئی۔ پھر میں نے سوچا کہ مختلف جہازوں کی مختلف حد ہوتی ہے۔ کوئی جہاز آدھ گھنٹہ اڑ کر اتر جاتا ہے کوئی ایک گھنٹہ اور کوئی دو گھنٹہ اور کوئی دس گھنٹے اڑنے کے بعد نیچے اترتا ہے۔

ٹھیک یہی معاملہ انسان کا بھی ہے۔ ایک شخص پیدا ہوتے ہی مرجاتا ہے۔ گویا اس کے جینے کی حد چند منٹ یا چند گھنٹے تھی۔ اسی طرح کوئی شخص چند سال گزار کر مرتا ہے۔ کوئی جوانی میں مرجاتا ہے۔ اور کوئی بوڑھا ہو کر مرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر عمر موت کی عمر ہے۔ آدمی کا ہر لمحہ اس کا آخری لمحہ ہے۔ ہر وقت آدمی اپنی آخری حد پر کھڑا ہوا ہے۔ زندگی کا یہ معاملہ اتنا عجیب ہے کہ آدمی اگر اس کو سوچے تو پر عیش محل میں بھی اس کی زندگی بے عیش ہو کر رہ جائے۔

تقریباً ساڑھے آٹھ بجے ہمارا جہاز پونہ ایرپورٹ پر اترا۔ کانفرنس کے نمائندے جو میری رہنمائی کے لئے آئے تھے وہ تو حسب قاعدہ ایرپورٹ کے باہر کھڑے ہوئے تھے۔ مگر حلقہ الرسالہ کے لوگ ایرپورٹ کے اندر مجھ سے ملنے کے لئے موجود تھے۔ میں نے پوچھا کہ آپ لوگ اندر کیسے آگئے کیونکہ اندر آنا تو منع ہے۔ جناب عبدالصمد صاحب نے بتایا کہ گیٹ پر کھڑے ہوئے ایرپورٹ کے آدمی نے ان کو روکا۔ پھر انھوں نے کہا کہ ہمارے "دھرم گرو" آرہے ہیں۔ یہ سن کر آدمی نے ان لوگوں کو اندر جانے کی اجازت دے دی۔ مذہب میں آج بھی وہ طاقت ہے جو کسی دوسری چیز میں نہیں۔ بشرطیکہ مذہب کو ماننے والے اپنے آپ کو اشتعال انگیز کارروائی سے دور رکھیں۔

کانفرنس والوں نے بلیو ڈائمنڈ ہوٹل (پونہ) میں قیام کا انتظام کیا تھا۔ چنانچہ سب لوگوں کے ساتھ پہلے ہوٹل پہنچا۔ یہ ہوٹل شہر کے باہر ہے۔ چنانچہ ہوٹل پہنچنے کے بعد ساتھیوں نے آپس میں مشورہ کرکے بتایا کہ وہ چاہتے ہیں کہ میرا قیام شہر میں ان لوگوں کے ساتھ ہو تاکہ زیادہ سے زیادہ ملاقات کی صورت نکل سکے۔ میں نے کہا کہ کانفرنس کے منتظمین اگر اجازت دے دیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ منتظمین نے اجازت دے دی۔ چنانچہ ہم سب لوگ ہوٹل سے شہر واپس آگئے۔

اس کے بعد میرا قیام پہلے مسٹر پی اے انعام دار کے مکان پر رہا۔ کانفرنس کے پروگرام کے مطابق، میٹنگوں میں شرکت کے لئے روزانہ ڈائمنڈ ہوٹل جاتا اور پھر دوبارہ انعام دار صاحب کے یہاں واپس آجاتا۔ آخر میں میرا قیام جناب عبدالصمد صاحب کے مکان پر تھا۔

پونہ اور بمبئی کے درمیان ایک تیز رفتار ٹرین چلتی ہے۔ اس کا نام "دکن کوئن" ہے۔ ٹرین کا نام پونہ کے نام پر ہے۔ مرہٹوارہ کا سب سے زیادہ خوبصورت شہر ہونے کی بنا پر پونہ کو دکن کوئن کہا جاتا تھا۔ اسی کے نام پر اس ٹرین کا مذکورہ نام رکھا گیا۔

سترھویں صدی میں مرہٹہ حکومت نے پونہ کو اپنی راجدھانی بنایا۔ کچھ عرصہ کے لئے اس پر مغلوں کا قبضہ ہو گیا۔ مگر ۱۷۱۴ سے دوبارہ مرہٹوں نے اس پر قبضہ کر لیا۔ ۱۸۱۷ میں برٹش حکومت نے اس پر قبضہ کیا جو ۱۹۴۷ تک قائم رہا۔

برٹش دور میں پونہ میں تعلیم کا رواج کافی بڑھا۔ یہاں سب سے زیادہ اسکول اور کالج قائم کئے گئے۔ چنانچہ جواہر لال نہرو نے ایک بار پونہ کو "انڈیا کا آکسفرڈ اور کیمبرج" کا نام دیا تھا۔ ۱۹۶۱ میں یہاں ایک ہیبت ناک واقعہ ہوا تھا۔ پنشیت ڈیم کسی وجہ سے منہدم ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قدیم پونہ کا ایک حصہ اس کی زد میں آکر بہہ گیا۔

دہلی سے پونہ ۱۶۰۰ کیلو میٹر دور ہے۔ قدیم زمانہ میں دہلی سے پونہ پہنچنے کے لئے ۱۶ دن سے بھی زیادہ وقت درکار تھا۔ مگر آج یہ سفر صرف دو گھنٹے میں طے ہو جاتا ہے۔ ۲ نومبر کو میں نے عصر کی نماز دہلی (نظام الدین) کی کالی مسجد میں ادا کی۔ مغرب کی نماز دوبارہ دہلی ایرپورٹ پر پڑھی۔ اور عشا کی نماز کے وقت میں پونہ پہنچ چکا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو دو پیروں کے ساتھ پیدا کیا تاکہ وہ چل سکے۔ پھر اس کو گھوڑا دیا

جو گویا سواری کی زندہ مشین ہے۔ اس کے بعد انسان پر اسٹیم اور پٹرول کی طاقت منکشف کی جس کے نتیجہ میں ٹرین اور کار بنے۔ اور آخر میں ہوائی جہاز جیسی تیز رفتار سواری اس کو عطا کی۔

اس تدریجی طریق کار کے نتیجہ میں ایسا ہوا کہ پیغمبروں میں سے کسی بھی پیغمبر کے لئے کار اور ہوائی جہاز پر بیٹھنا ممکن نہ ہو سکا۔ پیغمبر تمام انسانوں میں سب سے زیادہ مقدس لوگ تھے۔ مگر ان کے تمام تر تقدس کے باوجود خدا نے ان کے لئے اپنے قانون تدریج کو نہیں توڑا۔ اس سے خدا کی سنت کا اندازہ ہوتا ہے۔ تدریج اس دنیا کے لئے خدا کا اٹل قانون ہے۔ وہ کسی بھی وجہ سے اور کسی کے لئے بدلا نہیں جاتا۔

یہاں لوگوں نے بتایا کہ ۲۲ ستمبر ۱۹۹۱ کو پونہ میں گنیش چترتھی کا جلوس نکلنے والا تھا۔ اسی دن ۱۲ ربیع الاول کی تاریخ بھی تھی۔ اگر دونوں جلوس ایک دن نکلتے تو یقینی تھا کہ پونہ میں فرقہ وارانہ فساد ہو جائے اور جشن کا دن غم کے دن میں تبدیل ہو جائے۔ پونہ کی سیرت کمیٹی نے مشورہ کر کے یہ فیصلہ کیا کہ ہم لوگ اعراض کا طریقہ اختیار کریں۔ چنانچہ انھوں نے میلاد النبی کا جلوس چند دن موخر کر کے ۲۷ ستمبر کو نکالا۔ اس طرح دونوں جلوس پرامن طور پر دو الگ الگ تاریخوں میں نکلے اور کسی ٹکراؤ کی نوبت نہیں آئی۔ اس واقعہ پر پولیس کے لوگ اور ہندو حضرات بہت خوش ہوئے۔ اور مسلمانوں کی دانشمندی کی تعریف کی۔
اس طرح دونوں جلوس پرامن طور پر دو الگ الگ تاریخوں میں نکلے اور کسی ٹکراؤ کی نوبت نہیں آئی۔

سیرت کمیٹی پونہ نے اپنے فیصلہ کی اطلاع مراٹھی اخباروں میں شائع کرادی تھی۔ اس سے پورے مہاراشٹر کے مسلمانوں کو اس کی خبر ہو گئی۔ چنانچہ کئی مقامات پر مسلمانوں نے یہی کیا کہ اپنے جلوس کی تاریخ بدل دی۔ اس طرح پورا مہاراشٹر فساد کے خطرہ سے بچ گیا۔ یہ ایک علامتی واقعہ ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندستان کے مسلمانوں نے اب نیا فیصلہ کیا ہے۔ اب وہ ردعمل کی پالیسی ترک کر رہے ہیں اور اس کے بجائے اعراض کے طریقہ کو اپنی پالیسی کے طور پر اختیار کر رہے ہیں۔

پونہ میں ایک صاحب نے کہا کہ مجھے "شتم رسول" کے مسئلہ پر آپ سے سوال کرنا ہے۔ میں نے کہا کہ فرمائیے۔ اس کے بعد جب وہ بولے تو انھوں نے ایک پوری تقریر کر ڈالی۔ انھوں نے اپنے مفروضہ مخالفین کے اوپر الزام تراشی بھی کی۔ ان کی پرجوش تقریر ختم ہوئی تو میں نے نرمی کے ساتھ کہا: یہ اسلام نہیں ہے کہ آدمی تحقیر رسول کے مسئلہ کو جانے مگر وہ تحقیر مسلم کے مسئلہ سے بے خبر ہو۔

تقسیم ملک (۱۹۴۷) سے پہلے ایک بار کسی سفر کے دوران میں پونہ ریلوے اسٹیشن سے گزرا

تھا۔ اس وقت میں نے چلتی ہوئی ٹرین سے پونہ شہر کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ ریلوے لائن کے کنارے مجھے کچھ بنگلے دکھائی دئے جن کے اوپر پھول دار بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ اس مشاہدہ میں پونہ مجھے ایک افسانوی شہر نظر آیا تھا۔ میرے ذہن میں یہ تاثر قائم ہوا تھا کہ پونہ خوب صورت مکانات کا ایک شہر ہے جو چاروں طرف پھول اور سبزہ سے ڈھکا ہوا ہے۔

مگر ۱۹۷۱ میں جب پہلی بار میں نے پونہ کا سفر کیا اور شہر کے اندرونی حصوں کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ پونہ بھی ویسا ہی ایک شہر ہے جیسا کہ ہندستان کے دوسرے شہر۔ دوسرے تمام شہروں کی طرح یہاں بھی اگر خوبصورت مکانات ہیں تو اس کے ساتھ تنگ اور بے کشش مکانات کی قطاریں بھی۔

یہی بات انسان کے بارہ میں بھی ہے۔ کسی انسان سے ابتدائی ملاقات میں وقتی طور پر جو تاثر قائم ہوتا ہے وہ اکثر حالات میں نہایت ناقص بلکہ خلاف واقعہ ہوتا ہے۔ سنجیدگی اور احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ وقتی تجربہ کی بنا پر کبھی کلی رائے قائم نہ کی جائے۔ اس قسم کی رائے کو شریعت میں ظن کہا گیا ہے۔ کسی شہر کے بارہ میں ظن کے تحت رائے قائم کرلی جائے تو اس میں کوئی اخلاقی برائی نہیں۔ مگر انسان کے بارہ میں ظن کے تحت رائے قائم کرنا بے حد سنگین ہے۔ کیوں کہ اس میں اخلاقی پہلو شامل ہے اور وہ آدمی کو گناہ کے درجہ تک پہنچا سکتا ہے (الحجرات ۱۲)

۲ نومبر کی شام کو انعام دار صاحب کے مکان پر دیر تک نشست ہوئی۔ جناب انیس چشتی صاحب اور دوسرے صاحبان آگئے تھے۔ میں زیادہ تر لوگوں کی باتیں سنتا رہا۔ انیس چشتی صاحب تحریک پیام انسانیت سے وابستہ ہیں اور انھوں نے ملک کے مختلف گوشوں کا سفر کیا ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کیا ملک میں کوئی شخص یا ادارہ ایسا ہے جو مخصوص طور پر غیر مسلموں میں دین پہنچانے کا کام کر رہا ہو۔ انھوں نے کہا نہیں۔ ایسا تو کوئی بھی نہیں۔

یہ بلاشبہ انتہائی سنگین صورت حال ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے درمیان دوسری سرگرمیاں تو جاری ہیں مگر وہی اصل کام انجام نہیں دیا جا رہا ہے جو ہماری امت محمدی ہونے کی حیثیت کو متحقق کرتا ہے۔

انعام دار صاحب (پیدائش ۱۹۴۵) نہایت ذہین آدمی ہیں۔ انھوں نے کئی قیمتی باتیں کہیں۔ انھوں نے کہا کہ چودہ سو سال پہلے قرآن میں اقرأ کا حکم آنا اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ خدائی کلام ہے۔

چودہ سو سال پہلے ایک انسانی مصلح اگر عرب میں اٹھتا تو وہ صرف حال کے دائرہ میں سوچتا، جب کہ اقرأ ابدی دائرہ کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ حال کے اعتبار سے عرب میں یہ مسائل تھے کہ وہاں پانی نہیں۔ وہاں محفوظ راستے نہیں۔ ایک شخص جس کو صرف انسانی نظر حاصل ہو وہ اسی قسم کے وقتی مسائل میں الجھ جائے گا۔ مگر رسول نے علم کا پیغام دیا جو ابدی اہمیت کا حامل تھا۔ جو حال سے لے کر مستقبل تک انسان کے کام آنے والا تھا۔ اور جو اپنے وسیع انطباق کے اعتبار سے دوسرے تمام شعبوں کو بھی اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھا۔

پونہ کی مذاہب کانفرنس کی مختلف نشستوں میں اسلامی نقطۂ نظر پیش کرنے کا موقع ملا۔ اس کے علاوہ شہر میں بھی کئی پروگرام ہوئے۔ ان سب کا تذکرہ یکجائی طور پر آئندہ کیا جائے گا۔

فیروز پونا والا سے ملاقات ہوئی۔ وہ بے سودی تجارت کے پرجوش مبلغ ہیں۔ انھوں نے پونہ میں بینک سے پندرہ لاکھ روپیہ سودی قرض لے کر ایک انڈسٹری لگائی۔ وہ کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کے بعد انھوں نے سامان وغیرہ بیچ کر بینک کا قرض ادا کیا اور سود کے بغیر انڈسٹری چلانے کا فیصلہ کیا۔ آج وہ کامیابی کے ساتھ اپنی انڈسٹری چلا رہے ہیں۔

وہ بوہرہ فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ بوہرہ فرقہ کے لوگ تجارت میں بہت کامیاب ہیں۔ اس کا راز کیا ہے۔ انھوں نے کہا —— سادہ زندگی اور کم خرچ۔ ۴ نومبر کو مجھے انھوں نے اپنا کارخانہ دکھایا اور اپنے گھر بھی لے گئے۔ ان کی زندگی کو میں نے اس اصول کا معیاری نمونہ پایا۔ ان کا فلیٹ ۸ لاکھ روپیہ کا ہے۔ اور ان کی انڈسٹری ایک کرور روپیہ سے زیادہ کی ہے۔ مگر ان کی زندگی انتہائی حد تک سادہ ہے۔

پونہ کے قریب پیر قمر علی درویش (م ۶۳۲ ھ) کی درگاہ ہے۔ یہ درگاہ ۱۹۵۱ سے باقاعدہ رجسٹرڈ طور پر قائم ہے۔ ساتھیوں کے کہنے پر اس کو دیکھنے کے لئے گیا۔

یہاں "سوچنا بورڈ" پر کچھ ہدایات لکھی ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک ہدایت یہ ہے: نیاز اور دوسرے پروگرام مسلم طریقہ سے کرائیں۔ یہاں صحن میں کالے رنگ کا ایک گول پتھر رکھا ہوا ہے۔ اس کا وزن تقریباً ساٹھ کیلو ہے۔ طاقت ور آدمی اس کو اکیلا اٹھا سکتا ہے۔

اس پتھر کے لئے یہاں روایت ہے کہ قمر علی درویش کا نام لے کر اٹھانے سے وہ اپنے آپ

اٹھ جاتا ہے۔ طریقہ کے مطابق، گیارہ آدمی پتھر کے چاروں طرف کھڑے ہوتے ہیں۔ ہر ایک اپنی ایک انگلی پتھر سے لگاتا ہے۔ اور پھر ہر ایک لمبا سانس کھینچ کر کہتا ہے "قمر علی درویش ..." اس کے بعد پتھر اٹھ جاتا ہے۔ اور اس وقت تک اٹھا رہتا ہے جب تک سانس نہ ٹوٹے۔

میرے سامنے کئی بار لوگوں نے اس تدبیر پر عمل کر کے پتھر کو اٹھایا۔ تاہم میرا خیال ہے کہ یہ ایک سادہ فطری واقعہ ہے نہ کہ کوئی پراسرار واقعہ۔

پونہ کی مذاہب کانفرنس کے اجلاس بلیو ڈائمنڈ ہوٹل میں ہوئے۔ ۳۰ نومبر کو کانفرنس کے شرکاء تین مختلف گروپ میں بانٹ دئے گئے۔ میرے گروپ میں ایک درجن افراد تھے جو اسلام، ہندوازم اور مسیحیت سے تعلق رکھتے تھے۔ ہر ایک نے مذہب کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کئے۔ ذریعہ اظہار یہاں صرف انگریزی تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ دوسرے مذاہب کے لوگ عام طور پر اپنے آبائی مذہب کے بارہ میں بے یقینی کا اظہار کر رہے ہیں۔ مثلاً ہندو صاحبان نے اپنے حالات بتاتے ہوئے کہا کہ ہمارے مذہب میں انسانیت کو چار ذاتوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ یہ بات میرے ذہن کو اپیل نہیں کرتی۔ مسیحی حضرات نے اپنے بارہ میں بتایا کہ مسیح کی ابنیتِ خدا کا عقیدہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ وغیرہ

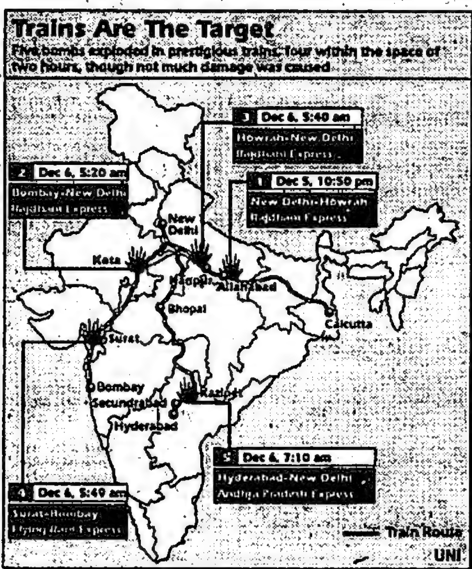
میری باری آئی تو میں نے کہا کہ میں نے اصلاً اسلامی مدرسہ میں تعلیم پائی ہے۔ انگریزی میں نے بعد کو پرائیویٹ طور پر پڑھی۔ مگر جو اسلام مجھے خاندانی وراثت یا مدرسہ کے ماحول میں ملا تھا۔ اس سے میرے اندر بغاوت پیدا ہوئی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد میں نے بطور خود اسلام کا اور دوسرے مذاہب کا باقاعدہ طور پر مطالعہ کیا۔ اس کے بعد اسلام کی صداقت از سر نو میرے اوپر منکشف ہوئی اور میں نے دوبارہ شعوری طور پر اسلام کو قبول کیا۔ اس طرح اسلام میرے لئے ایک ذاتی دریافت ہے نہ کہ محض قومی عقیدہ۔

میں نے کہا کہ اسلام کی فطری تعلیمات کے علاوہ اسلام کی جس چیز نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا وہ اسلام کا تاریخی پہلو تھا۔ دوسرے مذاہب کی کوئی معلوم اور مستند تاریخ نہیں۔ جب کہ اسلام مکمل طور پر اور مسلّمہ طور پر ایک تاریخی مذہب ہے۔ اسلام کو خصوصی اور امتیازی طور پر تاریخی اعتباریت (historical credibility) حاصل ہے۔ اور یہ وہ چیز ہے جو کسی بھی دوسرے مذہب کو

مختلف حصوں میں پانچ اہم ایکسپرس ٹرینوں میں رکھے ہوئے بم پھٹے۔ ان سے کئی افراد مر گئے اور بہت سے لوگ زخمی ہوگئے۔ پیٹریٹ (۷ دسمبر) کی سرخی یہ تھی :

Blasts mark demolition anniversary

بم دھماکا کا یہ واقعہ بیک وقت بزدلی بھی ہے اور فعل حرام بھی۔ جن نے ایسا کیا ہے اس کو اگر کچھ کرنا ہے تو وہ مجرموں کے ساتھ کرے۔ ٹرینوں میں سفر کرنے والے بے قصور مسافروں کو بم کا شکار بنانا تو انسانیت کے خلاف بھی ہے اور مذہب کے خلاف بھی۔



رڑکی میں ہمارے ساتھی رستوراں میں چائے پینے کے لیے ٹھہرے۔ میں نے چائے وغیرہ نہیں لی۔ میں باہر ٹہلتا رہا۔ رڑکی میں مسلمان بھی کافی آباد ہیں۔ اتفاق سے ایک تعلیم یافتہ مسلمان سے ملاقات ہوگئی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے بتایا کہ میں آپ کا الرسالہ پہلے پڑھا کرتا تھا۔ مگر اب میں نے اس کو چھوڑ دیا۔ میں نے سبب پوچھا تو انھوں نے کہا آپ آج کل جن باتوں کی تبلیغ کر رہے ہیں ان سے مجھے اتفاق نہیں۔

میں نے مزید تفصیل پوچھی تو انھوں نے اخبارات میں چھپنے والے بعض انٹرویو کا حوالہ دیا۔ میں نے کہا کہ رائے قائم کرنے کا یہ طریقہ اسلام کے خلاف ہے۔ اخباری انٹرویو کے متعلق معلوم ہے کہ وہ لوگ ہمیشہ بات

کو بدل کر اپنے رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ اس لیے میرے بارہ میں رائے قائم کرنے کے لیے آپ کو الرسالہ کے مضامین کو بنیاد بنانا چاہیے۔ یا خود میرے لکھے ہوئے مضامین (signed articles) جو کسی اخبار یا میگزین میں چھپیں۔ وہ ایسا کوئی حوالہ نہ بتا سکے۔

میں نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ تازہ آرگنائزر (۵ دسمبر ۱۹۹۳) میں میرا ایک انٹرویو چھپا ہے۔ اس کی سرخی انھوں نے یہ قائم کی ہے کہ —— ہندوازم ہی واحد رواداری مذہب ہے :

Hinduism is the only tolerant faith.

حالانکہ میں نے یہ بات نہیں کہی تھی۔ میں نے کہا تھا کہ ہندوازم اور اسلام دونوں میں یکساں طور پر مذہبی رواداری کی تعلیم دی گئی ہے۔ جو فرق ہے وہ صرف ریشنیل میں ہے نہ کہ خود رواداری میں۔ ہندوازم تعدد حقیقت کی بنیاد پر رواداری کی تعلیم دیتا ہے، اور اسلام احترام انسانیت کی بنیاد پر۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ ہندوازم میں رواداری کی بنیاد باہمی اعتراف (mutual recognition) پر قائم ہے اور اسلام میں رواداری کی بنیاد باہمی احترام (mutual respect) پر۔

ان کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا کہ میں علماء کے اس مسلک پر ہوں جو انھوں نے "رجوع" کے بعد اختیار کیا، آپ لوگ علماء کے اس مسلک پر چلنا چاہتے ہیں جو انھوں نے رجوع سے پہلے اختیار کر رکھا تھا۔

آپ کو معلوم ہے کہ ہندستان کی آزادی کی جدوجہد پہلے ہمارے علماء نے اٹھائی تھی۔ وہ اس کو تشدد کے اصول پر چلاتے رہے۔ مولانا محمود حسن دیوبندی ساڑھے تین سال کی قید کے بعد ۱۹۲۰ میں مالٹا سے واپس آئے تو اس وقت مہاتما گاندھی عدم تشدد کے اصول پر آزادی کی تحریک شروع کر چکے تھے۔ مولانا محمود حسن، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی اور دوسرے تمام علماء نے اپنے سابقہ موقف سے رجوع کر لیا۔ تقریباً ایک سو سال کے بعد انھوں نے متفقہ طور پر تشدد کے طریقہ کو چھوڑ کر عدم تشدد کے طریقہ کو اختیار کر لیا۔

۱۹۴۷ کے بعد کے ہندستان میں بھی یہی معاملہ ایک اور صورت میں پیش آیا۔ نئے جمہوری نظام میں مسلمانوں کو تعصب اور زیادتی کی شکایت ہوئی۔ انھوں نے دوبارہ لفظی جنگ کی صورت میں حقوق طلبی کی جدوجہد شروع کر دی۔ پچاس سال کا تجربہ بتاتا ہے کہ یہ پُرشور جدوجہد بے پناہ قربانیوں کے باوجود ناکام رہی۔

ں سابقہ علمار کی طرح موجودہ علمار اور رہنماؤں کو بھی ایک رجوع کی ضرورت ہے۔ اب تک وہ اپنی تحریک طالبۂ غیر کی بنیاد پر چلا رہے تھے۔ اب انھیں چاہیے کہ وہ اپنی تحریک کو تعمیر خویش کی بنیاد پر چلائیں۔ جلسوں ور مظاہروں کی دھوم مچانے کے بجائے وہ صرف داخلی استحکام پر اپنی ساری توجہ لگا دیں۔

رشی کیش سے دہلی تک دو تعلیم یافتہ ہندو میرے ساتھ تھے۔ سوامی وشومترا (۵۰ سال) اور پنڈت راجیو اگنی ہوتری (۲۵ سال) ان لوگوں سے مذہبی موضوعات پر مسلسل باتیں ہوتی رہیں۔

سوامی وشومترا ساؤتھ انڈیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان سے پوری گفتگو انگریزی میں ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ میں نے اسلام پر بہت کم چیزیں پڑھی ہیں۔ بنگلور میں ایک مسلمان نے مجھ کو ایک انگریزی کتاب پڑھنے کے لیے دی تھی۔ اس کو میں نے پورا پڑھا۔ اس کتاب کو پڑھ کر میں متاثر تو نہیں ہوا۔ البتہ مجھ کو غصہ بہت آیا۔

یہ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کی کتاب "رسالہ دینیات" کا انگریزی ترجمہ تھا۔ سوامی جی نے اس کتاب کو پڑھ کر کئی صفحات میں اس پر انگریزی میں اپنا تبصرہ لکھ رکھا تھا۔ اس کو انھوں نے اپنے کپڑے کے بیگ سے نکالا۔ اور اس کے مختلف حصے مجھے بتانے شروع کیے۔ انھوں نے کہا کہ لوگ اپنے مذہب کی بڑائی کو جانتے ہیں مگر وہ دوسروں کے مذہب کی بڑائی کو نہیں جانتے :

People know the greatness of their own religions, they don't know the greatness of other's religions.

میرے پوچھنے پر انھوں نے کہا کہ اسلام میں پرافٹ ہوتے ہیں اور ہندوازم میں رشی ہوتے ہیں۔ رشیوں کا درجہ پرافٹ سے زیادہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ پرافٹ کی مثال اس شخص کی ہے جو سمندر کے کنارے کھڑے ہوئے ٹاور پر چڑھ کر سمندر کا مشاہدہ کرتا ہے۔ مگر رشی ٹاور سے سمندر کو دیکھنے کے بعد خود سمندر میں اترے۔ انھوں نے اس کو چکھا اور اس کا تجربہ کیا (they tested and tasted it)

میں نے کہا کہ آپ مثال کی زبان استعمال نہ کریں بلکہ حقیقت کی زبان میں تقابل کریں۔ کیوں کہ نہ تو پیغمبر کسی لائٹ ہاؤس پر چڑھے اور نہ رشیوں نے کسی سمندر میں غوطہ لگایا۔ اس طرح کی مثالوں سے کوئی بات ثابت نہیں ہوتی۔ مثال کا طریقہ استدلال کا سب سے کمزور طریقہ ہے :

Analogy is the weakest form of argument.

مگر وہ بدستور مثال کی زبان میں بولتے رہے۔ میں نے کہا، اچھا، اب اپنا دوسرا پوائنٹ بتایئے۔

انھوں نے کہا کہ دوسرا فرق یہ ہے کہ اسلام میں تو صرف ایک پیغمبر نے کہا جو کچھ کہا۔ مگر ویدوں کی فلاسفی سیکڑوں رشیوں کی بنیاد پر قائم ہے۔ ویدک سسٹم میں ایک کے بعد ایک سیکڑوں رشیوں نے حقیقت کا تجربہ کیا۔ اس طرح اسلام شخص واحد کی معرفت پر بیس کرتا ہے جب کہ ویدک سسٹم انسانوں کے ایک مجموعہ کے عارفانہ تجربات پر مبنی ہے۔

میں نے کہا کہ مسئلہ ایک کا اور کئی کا نہیں ہے بلکہ اصل بات کے استناد (authenticity) کا ہے۔ پیغمبر خدائی الہام کے حوالے سے بولتا ہے۔ اس لیے اس کا کلام مستند ریفرنس پر قائم ہوتا ہے۔ جب کہ رشی اور منی ذاتی تجربہ کے حوالے سے بولتے ہیں۔ اس قسم کے ذاتی تجربات کے سلسلہ میں اصل سوال اس کا استناد ثابت کرنے کا ہے، وہ آپ کس طرح ثابت کریں گے۔

اب سوامی جی نے دوبارہ مثالیں دینا شروع کیا۔ انھوں نے کہا کہ رشیوں نے زبردست تپسیا کی۔ وہ دکھ جھیلنے (suffering) کے کورس سے گزرے۔ اس طرح انھوں نے سفرنگ کے راستہ سے معرفت حاصل کی۔ انھوں نے مثال دی کہ آپ کو کھانا بنانا ہے تو آپ یہ کریں گے کہ ایک برتن میں چاول، دال، پانی وغیرہ ڈال کر اس کو تیز آنچ پر پکائیں گے۔ اس طرح آگ پر پک کر وہ آپ کے کھانے کے قابل بن جائے گا۔ اسی طرح آدمی جب تلاش کی آگ میں جلتا ہے تو وہ گیان حاصل کر لیتا ہے۔

میں نے کہا کہ یہ بتایئے کہ سفرنگ اور دریافت میں کیا رشتہ ہے۔ آپ کو دونوں کے درمیان منطقی رشتہ بتانا ہوگا۔ اس کے بعد ہی آپ کی بات ثابت شدہ قرار پائے گی۔ کیوں کہ مثال کسی ثابت شدہ بات کی مزید وضاحت میں کارآمد ہو سکتی ہے۔ مگر خود اصل بات کو ثابت کرنے کے لیے مثال قطعاً کارآمد نہیں۔

مگر یہ لوگ مثالوں کی زبان میں بولنے کے اتنے زیادہ عادی ہو چکے ہیں کہ وہ سائنٹفک یا منطقی زبان میں اپنی بات پیش کرنا جیسے جانتے ہی نہیں۔ میں نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ اچھا، اب اپنا اگلا پوائنٹ بتایئے۔

انھوں نے کہا کہ ویدک مذہب کی ایک عظیم خصوصیت اس کی لامحدود آزادی ہے۔ آپ آستک ہوں یا ناستک، آپ کنزرویٹو ہوں یا لبرل، آپ مورتی پوجا کو مانیں یا نہ مانیں۔ غرض جو بھی آپ کا

عقیدہ ہو، ہر حال میں آپ ہندوازم کے وسیع دائرہ میں شامل رہتے ہیں۔

میں نے کہا کہ اس کا نام فریڈم نہیں ہے۔ یہ تو ایک قسم کی مذہبی انارکی ہے۔ گیان یا معرفت لازمی طور پر تعین چاہتے ہیں۔ اگر تعین نہ ہو تو گیان اور اگیان میں کوئی فرق ہی باقی نہ رہے گا۔ جس چیز کو آپ فریڈم کہہ رہے ہیں اس سے تو صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ حقیقت اعلیٰ کو ابھی تک دریافت ہی نہ کر سکے۔ سوامی جی نے دوبارہ اپنی بات کی تائید میں مثالیں پیش کرنا شروع کیا۔ چنانچہ مجھ کو پھر معافی مانگتے ہوئے یہ کہنا پڑا کہ مثالوں سے کوئی بات ثابت نہیں ہوتی۔

آخر میں انھوں نے رسالہ 'دینیات (انگریزی) سے ایک اقتباس پڑھ کر سنایا جو ان کے نزدیک ان کے نقطۂ نظر کے حق میں ایک حتمی دلیل تھا۔ یہ اقتباس کتاب کے اُردو اڈیشن میں "نبوت محمدی کا ثبوت" کے زیر عنوان دیکھا جا سکتا ہے۔

سوامی جی نے کہا کہ دیکھئے، یہاں مصنف خود کہہ رہے ہیں کہ پیغمبر اسلام ایک اَن پڑھ آدمی تھے۔ وہ جس سماج میں پیدا ہوئے وہاں تعلیم اور تہذیب موجود نہ تھی۔ لوگ وحشیانہ کاموں میں مبتلا تھے۔ جہالت اور لاقانونیت عام تھی۔ پھر ایسے ماحول میں پیدا ہونے والا آدمی کس طرح کوئی اونچا گیان حاصل کر سکتا ہے۔ انھوں نے جوش کے ساتھ کہا کہ ذرا آپ دیکھئے، مصنف کے بیان میں کتنا بڑا تضاد (contradiction) ہے کہ جس آدمی کو وہ خود اَن پڑھ اور وحشی سماج کی پیداوار بتاتے ہیں اسی کو ہمیشہ کے لیے ساری دنیا کا پرافٹ مان رہے ہیں۔

میں نے کہا کہ یہ کتاب میں نے پڑھی ہے۔ مصنف نے مذکورہ باب میں جو بات کہی ہے وہ پیغمبر کے حق میں بطور استدلال ہے اور آپ اس کو اس معنی میں لے رہے ہیں کہ پیغمبر کی شخصیت کس طرح بنی۔ سوامی جی دوبارہ تھوڑی دیر تک انگریزی میں کچھ بات بولے۔ میں نے نرمی سے یاد دلایا کہ سوامی آپ کی یہ بات اصل بحث سے متعلق (relevant) نہیں ہے۔ آخر میں وہ کار کی سیٹ پر پیٹھ ٹیک کر سیدھے بیٹھ گئے اور اپنی آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا: صبح کے وقت میں زیادہ بولنے کا عادی نہیں ہوں، آج صبح میں نے اشنان بھی نہیں کیا، اس لیے میرے سر میں ہلکا درد بھی ہے۔ اس کے بعد ہم دونوں خاموش ہو گئے۔

پنڈت راجیو اگنی ہوتری نے کہا کہ اسلام کی کوئی وشیش بات بتائیے۔ میں نے قرآن کی ایک آیت کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ برے سلوک کے جواب میں اچھا سلوک کرو۔ اس کے بعد جو تمہارا دشمن ہے وہ بھی

تمہارا دوست بن جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر آدمی آپ کا امکانی دوست ہے۔ نفرت اور دشمنی یہ سب اوپری چیزیں ہیں۔ اوپر سے کوئی غیر انسان دکھائی دے رہا ہو تب بھی اندر سے وہ انسان ہی ہوگا۔

انھوں نے کہا کہ پہلے زمانہ میں دھرم کا پرچار بہت کم تھا۔ اتنے ست سنگ نہیں ہوتے تھے۔ پھر بھی شانتی تھی۔ اب ہر طرف دھرم کا پرچار ہے۔ ہر جگہ ست سنگ کی دھوم ہے۔ مگر شانتی غائب ہے۔ یہ سوال میں نے کئی لوگوں سے کیا مگر ابھی تک مجھے اتر نہیں ملا۔ میں نے پوچھا کہ آپ کا اپنا خیال کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ میرے من میں ایک اتر ہے، اور وہ یہ کہ پہلے کہنی اور کرنی ایک تھی۔ اب کہنی اور کرنی میں مُت بھید ہو گیا ہے۔

میں نے کہا کہ آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔ آج مذہب کے نام پر بہت سرگرمیاں دکھائی دیتی ہیں مگر یہ ویسی ہی ہیں جیسے دوسری تجارتی سرگرمیاں۔ موجودہ زمانہ کے نئے حالات نے مذہب میں دنیوی انٹرسٹ کا پہلو بہت زیادہ بڑھا دیا ہے۔ آج مذہب میں پیسہ بھی ہے۔ لیڈری اور عہدہ بھی۔ عزت اور شہرت بھی ہے۔ دنیا کی سیر بھی ہے۔ چنانچہ لوگوں نے مذہب کے نام پر بھی وہی کچھ حاصل کرنا شروع کر دیا ہے جس کو پہلے زیادہ تر دنیا کے نام پر حاصل کیا جاتا تھا۔

دہلی پہنچ کر ہماری گاڑی پہلے پر ماتھ نکیتن آشرم (گرین پارک) میں رکی۔ یہاں ڈاکٹر کے ایل سیشا گری راؤ عارضی طور پر مقیم تھے۔ وہ امریکہ کے ورجینیا یونی ورسٹی میں تقابلی مذہب کے پروفیسر ہیں۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ تک ان سے مفید ملاقات رہی۔ وہ اس سے پہلے میری کئی چیزیں پڑھتے رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مجھے تعجب انگیز خوشی (Pleasant surprise) کا احساس اس پر ہوتا ہے کہ آپ اتنی زیادہ ہوش مندی (sanity) کی بات کرتے ہیں اور پھر بھی آپ اتنے زیادہ پڑھے جاتے ہیں۔ یہ آپ کو زمانہ کے لحاظ سے ایک استثنائی نعمت حاصل ہے۔

آج ہی کے ٹائمس آف انڈیا (، دسمبر) میں میرا ایک مضمون چھپا تھا جس کا عنوان تھا :

Time ripe to end Ayodhya dispute.

انھوں نے اس مضمون کو دیکھا اور میرے نقطۂ نظر سے اتفاق کیا۔ اس پر اور دوسرے موضوعات پر ان سے دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ ان کا خیال ہے کہ موجودہ زمانہ میں سچا مذہبی آدمی وہ ہے جو سائنس داں ہو، اور سچا سائنس داں وہ ہے جو مذہبی ہو۔ انھوں نے کہا :

A saint cannot be a true saint, if he is not a scientist. A scientist cannot be a true scientist, if he is not a saint.

میرے ایک سوال کے جواب میں انھوں نے مزید کہا کہ جدید سائنس کی اپنی محدودیتیں ہیں۔ کیوں کہ وہ سائنٹفک طریقہ پر زندگی کے اندرونی حقائق کا پتہ نہیں لگا سکتی :

Modern science has its limitations as it does not pursue inner life with a scientific outlook.

ڈاکٹر سیشا گری راو ورجینیا یونی ورسٹی میں پروفیسر تھے۔ وہاں ان کو ۸۰ ہزار ڈالر سالانہ مل رہے تھے۔ مگر انسائیکلوپیڈیا آف ہندوازم کے لیے انھوں نے یونی ورسٹی کی سروس چھوڑ دی۔ اب وہ رضاکارانہ طور پر انسائیکلوپیڈیا کی تکمیل میں لگے ہوئے ہیں۔ وہ اس کے چیف ایڈیٹر ہیں۔ یہ بات مجھے بعد کو سوامی چیدانند نے بتائی۔

۷ دسمبر کی سہ پہر کو میں دہلی پہنچا۔ یہاں آج ہی خودکشی کا ایک واقعہ ہوا تھا جس کو ایک صاحب نے مجھے بتایا (اس واقعہ کی تفصیل ٹائمس آف انڈیا ۸ دسمبر ۱۹۹۳ میں دیکھی جا سکتی ہے)

ڈاکٹر دھریندر کانت داس (Dhirendra Kanta Das) انڈین آرمی میں میجر جنرل کی پوزیشن پر تھے۔ وہ میڈیکل شعبہ (Armed Forces Medical Services) کے ڈائرکٹریٹ میں اڈیشنل ڈائرکٹر جنرل تھے۔ سینیریٹی کے اعتبار سے ان کو اب پروموشن ملنا چاہیے تھا۔ اس طرح وہ ڈائرکٹر کے عہدہ پر پہنچ جاتے مگر ان کے نیچے کے ایک افسر ایس جی نیوگی نے حکومت سے پروموشن آرڈر حاصل کر لیا۔ وہ ان کو سپرسیڈ کر کے ڈائرکٹر کے عہدہ پر پہنچ گیا۔ ڈاکٹر داس اس ذلت کو برداشت نہ کر سکے۔ وہ اپنے دھولا کنواں کے مکان میں باتھ روم کے اندر ایک رسی کے پھندے سے لٹک گئے اور اس طرح خودکشی کر لی۔ اس وقت ان کی عمر ۵۷ سال تھی۔ ۳۱ جنوری ۱۹۹۴ کو وہ ریٹائر ہونے والے تھے۔

ڈاکٹر داس نہایت صحت مند تھے۔ ان کے دو بچوں میں سے ایک لڑکا ایم ڈی کر چکا تھا۔ وہ ریٹائر ہو کر دہلی میں ایک اچھی زندگی گزار سکتے تھے۔ مادی اعتبار سے ان کے یہاں کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ اس کے باوجود انھوں نے کیوں خودکشی کر لی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے پروموشن کے معاملہ کو اپنے لیے وقار کا مسئلہ بنا لیا۔ ایک خیالی بات ان کے لیے تمام حقیقی باتوں سے زیادہ اہم ہو گئی۔

وہ اتنا زیادہ نروس ہوئے کہ انھوں نے خود اپنے آپ کو مار ڈالا۔

میں نے اپنے ساتھی سے کہا کہ کسی چیز کو وقار کا مسئلہ بنانا سراسر ہلاکت ہے، فرد کے لیے بھی اور قوم کے لیے بھی۔ آدمی پر لازم ہے کہ جو چیز جس درجہ کی ہے اس کو اسی درجہ میں رکھے، کسی چیز کو اس کے واقعی درجہ سے بڑھانے ہی کا یہ مہلک نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ چیز وقار کا سوال بن جاتی ہے۔ اگر چیزوں کو ان کے واقعی درجہ میں رکھا جائے تو کبھی وہ وقار کا سوال نہ بنے جو افراد اور قوموں کو خودکشی کے مرحلہ تک پہنچا دیتا ہے۔

رشی کیش میں چند دن گزار کر میں دہلی واپس پہنچا تو خیال آیا کہ رشی کیش ہندستان کا روحانی مرکز ہے اور دہلی ہندستان کا سیاسی مرکز۔ رشی کیش میں ہر طرف روحانی سکون کا ماحول تھا، دہلی میں ہر طرف سیاسی اضطراب کا ماحول۔ ملک میں یہ دونوں دھارے اسی طرح الگ الگ بہہ رہے ہیں جس طرح پریاگ (الٰہ آباد) میں گنگا اور جمنا کا پانی الگ الگ بہتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

آج ملک کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ یہ دونوں انسانی دھارے ایک دوسرے میں مل جائیں، روحانیت میں سیاسی آفاقیت پیدا کی جائے اور سیاست کو روحانی غسل دے دیا جائے۔ دو دھاروں کے اسی ملاپ میں ہندستان کی ترقی کا راز چھپا ہوا ہے۔

خبرنامہ اسلامی مرکز ۹۱

۱۔ انگریزی اخبار نیشن اینڈ دی ورلڈ (نئی دہلی) کے نمائندہ مسٹر اصغر علی نے ۱۰ مئی ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر الرسالہ مشن سے تھا۔ انٹرویو ایک گھنٹہ تک جاری رہا۔

۲۔ انگریزی اخبار اکنامک ٹائمس کے نمائندہ مسٹر سنیل رمن نے ۱۲ مئی ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ انٹرویو تقریباً ایک گھنٹہ تک جاری رہا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے بعد پیدا ہونے والے ملکی حالات سے تھا۔

۳۔ ہندی روزنامہ نوبھارت ٹائمس کے نمائندہ مسٹر سدانند پانڈے نے ۱۲ مئی ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ دیش کی ترقی کے لیے سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ لوگوں کی سوچ کو تعمیری سوچ بنایا جائے اور الگاؤ واد کو ختم کرکے بھائی چارہ اور ایکتا کا مزاج پیدا کیا جائے۔

۴۔ کستورباگرام (اندور) میں ۲۹ ـ ۳۰ مئی ۱۹۹۳ کو ایک آل انڈیا سمیلن ہوا۔ اس کا موضوع چیتنا ابھیان تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور اپنے خیالات پیش کیے۔ اس سفر کی تفصیلی روداد انشاء اللہ آئندہ شائع کی جائے گی۔

۵۔ ہندی اخبار چوتھا سنسار (اندور) نے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو اس کے شمارہ ۳۰ مئی ۱۹۹۳ میں نمایاں طور پر شائع ہوا ہے۔ اس کا تعلق زیادہ تر موجودہ حالات اور مسلم مسائل سے تھا۔

۶۔ سکندرآباد (یوپی) میں مولانا آزاد ریسرچ اینڈ ایجوکیشنل فاؤنڈیشن کے تحت ۳۰ مئی ۱۹۹۳ کو ایک سیمنار ہوا۔ اس کا عنوان تھا ہندستانی مسلمان اور پریس (Indian Muslims and the Press) پروگرام کے مطابق، صدر اسلامی مرکز کو اس موقع پر کی نوٹ ایڈریس پیش کرنا تھا۔ مگر بعض وجوہ سے وہ شرکت نہ کر سکے۔ تاہم اس موضوع پر ان کا لکھا ہوا مقالہ پڑھا گیا۔ یہ مقالہ اردو میں قومی آواز (۲۱ جون ۱۹۹۳) میں چھپا ہے۔ اور اس کا انگریزی ترجمہ کئی انگریزی اخباروں میں چھپ چکا ہے۔

۷۔ آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر یکم جون ۱۹۹۲ کو نشر کی گئی۔ اس کا موضوع تھا "فلسفۂ قربانی" اس میں بتایا گیا کہ قربانی کے عمل میں جانور کا ذبیحہ ایک علامتی قربانی ہے۔ اس عمل کا اصل مطلوب یہ ہے کہ آدمی کے اندر نفسیاتی قربانی کی صلاحیت پیدا ہو۔

۸۔ ۸ جون ۱۹۹۳ کو راشٹریہ سہارا (انگلش میگزین) کے نمائندہ مسٹر پردیپ ماتھر نے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر مسلم پرسنل لا، کامن سول کوڈ اور تطلیق ثلاثہ کے مسائل سے تھا۔

۹۔ اسٹوڈنٹس اسلامک ویلفیر سوسائٹی (لکھنؤ) کے سالانہ پروگرام (رحلة سنوية) کے تحت مختلف دینی مدرسوں کے ۲۵ طلبہ ۲۸ جون ۱۹۹۳ کو اسلامی مرکز میں آئے۔ انھوں نے مرکز کے شعبوں کو دیکھا۔ نماز مغرب کے بعد ان کا اجتماع ہوا۔ سوال و جواب کی صورت میں صدر اسلامی مرکز سے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ گفتگو ہوئی۔ اس میں مختلف دینی، علمی اور ملی سوالات زیر بحث آئے۔

۱۰۔ انگریزی اخبار پانیر کے نمائندہ مسٹر اعجاز اشرف نے ۲ جولائی کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو پانیر کے شمارہ ۴ جولائی ۱۹۹۳ میں چھپا ہے۔ سوالات کا تعلق الرسالہ مشن، ملکی حالات، ملی مسائل وغیرہ سے تھا۔

۱۱۔ دہلی کے ہندی ہفت روزہ نئی زمین کے نمائندہ مسٹر کرمانی نے ۳ جولائی ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا تعلق زیادہ تر نکاح و طلاق کے شرعی مسئلہ سے تھا۔ تطلیقات ثلاثہ کے سلسلہ میں فقہاء کا مسلک کیا ہے، اس کی تفصیل بتائی گئی۔

۱۲۔ فرنچ نیوز ایجنسی (نئی دہلی) کے نمائندہ مسٹر انیل پنا (Anil Penna) نے ۴ جولائی ۱۹۹۳ کو ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اس سے تھا کہ طلاق کا شرعی طریقہ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں حنفی مسلک اور غیر حنفی مسلک کی وضاحت کی گئی۔

۱۳۔ انگریزی روزنامہ انڈین اکسپرس کے نمائندہ مسٹر گنیش نے ۵ جولائی ۱۹۹۳ کو ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا تعلق زیادہ تر اس سے تھا کہ شریعت اسلامی میں

طلاق کا طریقہ کیا ہے اور تین طلاق کے بارہ میں فقہاء کے درمیان کس قسم کے اختلافات ہیں۔

۱۴۔ انڈیا ٹوڈے (ہندی) کے سب ایڈیٹر مسٹر سنجے چوہان نے ۱۰ جولائی ۱۹۹۲ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر "تین طلاق" کے مسئلہ سے تھا۔ اس سلسلہ میں مختلف فقہی مکاتب فکر کی رائے کی وضاحت کی گئی۔

۱۵۔ ایرانی نیوز ایجنسی (IRNA) کے نمائندہ مسٹر محمد سعید عالم نے ۲۱ جولائی ۱۹۹۲ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر بوسنیا ہرزیگو وینا کے موجودہ مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ بوسنیا کے مسلمانوں کو اپنی تحریک مقامی عیسائیوں کو ساتھ لے کر چلانا چاہیے تھا۔ اگر وہ اس حکمت کو ملحوظ رکھتے تو یقیناً وہ کامیاب رہتے۔

۱۶۔ دہلی کی مسجد سنگ تراشان (پہاڑ گنج) میں ۲۲ جولائی ۱۹۹۲ کو بعد نماز جمعہ ایک اجتماع ہوا۔ اس میں تاجر حضرات اور اسکول اور کالج سے تعلق رکھنے والے حضرات اکٹھا ہوئے۔ اس موقع پر صدر اسلامی مرکز نے مفصل تقریر کی۔ اس میں بتایا کہ اس وقت امت میں ہر قسم کی دینی سرگرمیاں جاری ہیں۔ مگر ایک اہم اسلامی تعلیم حذف ہوگئی ہے اور وہ صبر ہے۔ اس کی وجہ سے ہر محاذ پر ناکامی ہو رہی ہے۔

۱۷۔ مشہور انگریزی صحافی گری لال جین کا انتقال ۱۹ جولائی ۱۹۹۲ کو ہوا۔ ان کی یاد میں ۲۴ جولائی کو فکی آڈیٹوریم (نئی دہلی) میں ایک میٹنگ ہوئی۔ اس موقع پر انگریزی اخباروں کے ایڈیٹر اور اعلیٰ تعلیم یافتہ اصحاب جمع ہوئے۔ منتظمین کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے بھی شرکت کی اور گری لال جین اور ملک کی انگریزی صحافت کے بارہ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

۱۸۔ مسز مایارام (Shail Mayaram) جے پور کے انسٹی ٹیوٹ آف ڈولپمنٹ اسٹڈیز میں اسوسی ایٹ فیلو ہیں۔ وہ اسلام اور اسلامی تحریکوں کے بارہ میں ریسرچ کر رہی ہیں۔ یکم اگست ۱۹۹۲ کو انھوں نے صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو ریکارڈ کیا۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ

ہندستان کے لیے		بیرونی ممالک کے لیے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs 70	ایک سال	$20 / £10	$10 / £5
دو سال	Rs 135	دو سال	$35 / £18	$18 / £8
تین سال	Rs 200	تین سال	$50 / £25	$25 / £12
پانچ سال	Rs 300	پانچ سال	$80 / £40	$40 / £18
خصوصی تعاون (سالانہ)	Rs 500	خصوصی تعاون (سالانہ)	$100 / £50	

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

